فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	عبادت کا مفہوم	عظمیٰ پروین	8
قولِ نبی ﷺ	سیاست نبویؐ کا بین الاقوامی مزاج	محمد اکرم طاہر	11
خاص مضمون	طیب اردگان کا ترکی	میر بابر مشتاق	15
نوائے شوق	نعت	آمنہ رمیصا زاہدی	22
	سلام	کرامت بخاری	23
	غزل	نجمہ یاسمین یوسف	23
	غزل	حبیب الرحمٰن	24
	شاعرہ	رفعت خان	24
	حجاب	ڈاکٹر عزیزہ انجم	25
حقیقت و افسانہ	ڈائن	ام ایمان	26
	ہاتھ سے جنت نہ گئی	ربیعہ ندرت	28
	مجھے تیری ضرورت ہے	ڈاکٹر شگفتہ نقوی	34
انتخاب	دوپہر اور جگنو	منشا یاد	42
طویل کہانی	پس آئینہ	نصرت یوسف	46
سیر و سیاحت	نیویارک میں چند روز	صائمہ اسما	56
نمایاں خواتین کا تذکرہ	مدر ٹریسا	آسیہ راشد	62
ہلکا پھلکا	ٹھہرا ے شوق بیتابی	ذروہ احسن	66
	خطِ لاہور تیرے بسیار خوروں کو سلام	محمد صفدر بشیر	68
نہاں خانہ دل	اجنبی نہیں ہیں ہم!	فرحت طاہر	73
پل صراط پر	دو متوازی دھارے	افشاں نوید	76
محشر خیال	کرامت بخاری، قانتہ رابعہ، ڈاکٹر تحریم اعجاز		78
گوشہِ تسنیم	بعد از خدا	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	79

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! ربیع الاول کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں سیرت النبی اور نعت خوانی کی محافل کا انعقاد اس ماہ کی خصوصی سرگرمی ہوتی ہے۔ ناہید قاسمی کی ایک خوبصورت نعت کی چند سطریں:

پہلی ہجری صدی کا پہلا سال۔۔۔میری تقدیر میں لکھا ہوتا!
آپ کے حکم پر مدینے کو.....میں بھی ہجرت کا لطف پا لیتی
آپ کو تکتی ،آپ کو سنتی
اور پھر گرد گرد پلکوں سے .....آپ کے سب نقوشِ پا چنتی
میری آنکھوں میں چاند بس جاتے.....میرے کانوں میں انگبیں گھلتی
رات کی تیرگی چمک اٹھتی .....روح کی خامشی چہک اٹھتی
آپ کے نقشِ پا سے اڑتے ہوئے
ریت کے آفتابی ذروں کو.....اپنی چادر میں ٹانک لیتی میں
میرے سر پر جو ہاتھ رکھتے آپ
میں اس اعزازِ لمس کے دم سے .....عمر بھر کے لیے سنور جاتی
کاش میں اب نہ ہوتی .....تب ہوتی!!

آج آپ ﷺ کی امت انتشار، مصائب اور فتنوں کی زد میں ہے۔ ایک طرف جابر، اقتدار کے حریص حکمران اپنے ہی مسلمان عوام پر خدا کا قہر بنے ہوئے ہیں، دوسری طرف جہاد کے نام پر مسلمان مسلمانوں اور غیر مسلموں کے قتل و غارت میں ملوث ہیں، دونوں صورتوں میں ہم امت کے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، مسلمان ممالک اپنے اپنے مفادات کی بنا پر کوئی مؤثر کردار ادا کرنے سے گریزاں ہیں۔ نو گیارہ کے بعد صدر بش نے اس کو صلیبی جنگ کا آغاز قرار دیا تھا اور اب پیرس حملوں کے بعد پوپ نے اس کو تیسری عالمی جنگ کا آغاز کہہ کر گویا چرچ کی زبان سے وہی بات کی ہے۔ دہشت گردی کے خطرے کی پیشگی اطلاع کے باوجود بندوق بردار حملہ آوروں کا شہر کے مختلف مقامات سے یکا یک پھوٹ پڑنا، سٹیڈیم میں ملکی صدر کی موجودگی کے باعث انتہائی الرٹ سیکیورٹی کے باوجود ان کا اندر گھس آنا، اس واقعے کو چارلی ایبڈو معاملے کے تناظر میں دیکھا جائے تو بہت کچھ خود بخود سمجھ میں آتا ہے۔ پیرس میں حملوں کی ذمہ داری داعش نے قبول کر لی ہے اور شامی پاسپورٹ ملنے کی بنا پر شام پر حملوں کا آغاز کر دیا گیا ہے جن میں فرانس کی مدد صرف امریکہ ہی نہیں بلکہ مسلم ممالک بھی کر رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر چلنے والی فوٹیج میں واضح ہے کہ یہ حملے دہشت گردوں کے نام پر شہری آبادیوں اور معصوم بچوں پر ہو رہے ہیں۔ داعش اور نیٹو کا گٹھ جوڑ زیادہ واضح ہو رہا ہے۔ مقصد شام پر بمباری کر کے باغیوں کا زور توڑنا ہے۔

مسلمانوں کے لیے حالات دن بدن زیادہ آزمائش کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ ہماری اپنی کمزوریوں کے باعث ہے۔ ہمیں سیسہ پلائی دیوار بن کر دشمن کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس دیوار میں رخنوں کی وجہ سے ہی دشمن ہماری اپنی صفوں میں گھس آیا ہے اور اب حال یہ ہے کہ دوست اور

دشمن کی تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ امین

دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیلنے کا ہی نتیجہ ہے کہ بنگلہ دیش میں بھارت نواز حکومت چوالیس سال بعد بھی جرم وفا کے گنہ گاروں کو تختۂ دار پر کھینچ رہی ہے۔ مگر آفرین ہے ان پر جنھوں نے اپنے اس جرم کی لاج تختۂ دار تک رکھی اور معافی مانگ کر جان بچا لینے کی ہر پیشکش ٹھکراتے رہے۔ یہ امت کے ماتھے کا جھومر، نبی ﷺ سے وابستگی کی لاج رکھنے والے، کلمہ طیبہ کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملک ...مدینہ سے نظریاتی و قلبی وابستگی رکھنے والے ملک کی سالمیت کے لیے جان دے دینے والے.....خود کو والیِ مدینہ ﷺ کے آگے سرخرو کر گئے۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

یہ سزائیں نہ صرف انسانی بنیادوں پر ایک گری ہوئی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہیں، تاریخی حقائق سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں، انصاف کے تقاضوں سے بعید ہیں بلکہ بین الاقوامی جنگی قوانین کی بھی خلاف ورزی پر مبنی ہیں۔ حالیہ سزاؤں میں قمر الزماں چوہدری بھی شامل تھے جن کی عمر سقوط ڈھاکہ کے وقت زیادہ سے زیادہ پندرہ برس ہوگی۔ وہ پاکستان کے سابق قائم مقام صدر اور سپیکر قومی اسمبلی کے صاحب زادے تھے۔ پاکستان کے اس وارث کو ملتی باہنی کے وارثوں نے اپنی کینہ پروری کا نشانہ بنا دیا۔ مگر افسوس ہمارے حال پر ہے کہ ان پے درپے پھانسیوں کے بعد حکومت کو محض ایک مذمتی بیان کی توفیق ہوئی۔ میڈیا میں چند باضمیر عناصر نے آواز اٹھائی مگر زیادہ تر کے مفادات نے ان کو اجازت نہ دی۔ ایکسپریس نیوز کے اینکر پرسن احمد قریشی نے تجویز پیش کی ہے کہ پاکستان کے لیے مجرم ٹھہرائے جانے والے ان ہیروز کو نشانِ پاکستان سے نوازا جائے اور ملک و قوم کے محسن اور ملکی سالمیت کے محافظ کے طور پر ان کی قربانیوں کا اعتراف کیا جائے۔ ہم اس تجویز کو ایک مطالبے کی شکل دیتے ہوئے حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ ان شہدا کے لیے نشانِ پاکستان کا اعلان کیا جائے اور قوم کو سرکاری سطح پر ان کی قربانیوں سے آگاہ کیا جائے۔

بھارت میں ہندو انتہا پسندی اور منافرت کے مظاہروں کا نیا ہدف فلم سٹار اور سوشل ایکٹیوسٹ عامر خان ہے۔ اس سے قبل مودی سرکار کی انتہا پسندی پر بھارت کی فلم انڈسٹری سے وابستہ افراد نے شیو سینا کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ مگر لگتا ہے کہ اس وقت بھارت کا سیکولر چہرہ شیو سینا کے ہاتھوں بری طرح یرغمال بنا ہوا ہے۔ حیرت ہے کہ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں انسانی حقوق کی معمولی خلاف ورزیوں پر شور مچانے والی بین الاقوامی برادری کی طرف سے بھارت کے اس رویے پر کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔

احمد فراز کے ان اشعار کے ساتھ اجازت دیجیے

شہر والے سب امیرِ شہر کی مجلس میں ہیں
کون آئے گا غریبِ شہرِ نا پرساں کے پاس
لوگ کیوں کرتے ہیں اب چارہ گری کے تذکرے
اب بجز حرفِ تسلی کیا ہے غم خواراں کے پاس

طالبہ دعا

صائمہ اسما

پروفیسر محمد اکرم طاہر

سیاستِ نبویؐ کا بین الاقوامی مزاج

ان اعلیٰ اقدار کا جائزہ، جن کی بدولت آپؐ نے دنیا کا سیاسی مزاج بدل ڈالا

مدینہ کی حکومت دس سال میں 274 مربع میل یومیہ کے حساب سے بڑھی۔ مورخین اور محققین اسلام اس وسیع اشاعت پر انگشت بدنداں ہیں۔ حضورؐ نے دنیا کی جغرافیائی صورت حال کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔

اس سے بھی بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی نبوت کی برکت سے دنیا کا سیاسی مزاج بدلا۔ فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ کی ہدایت پر ابو سفیان کو ایک تنگ گھاٹی کے پاس پہاڑی کے اوپر سے اسلامی لشکر کی پیش قدمی کا نظارہ کرایا۔ ابوسفیان مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس نے حضرت عباسؓ سے کہا ''عباس! تمہارے بھتیجے کی بادشاہت تو بہت دور تک قائم ہوگئی ہے۔'' حضرت عباسؓ نے جواب دیا۔ ''یہ بادشاہت نہیں، نبوت ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ آپؐ نے بین الاقوامی سیاسیات میں حریت، مساوات، رواداری اور عدل و انصاف کی شاندار روایات قائم کیں۔ واقعتاً یہ اقتدار کی جنگ نہیں، اقدار کی جنگ تھی۔ ان اقدار عالیہ کا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

1۔ اسلامی انقلاب بنی نوع انسان کے لئے سچی آزادی کا پیام لے کر آیا۔ نظام جاہلیت نے بنی نوع انسان کو جن ناروا پابندیوں میں جکڑ ہوا تھا اسلام نے ان میں سے بعض کو فی الفور اور بعض کو بتدریج ختم کر ڈالا۔ انسان پر انسان کی خدائی کا دور تمام ہوا۔ قرآن پاک میں حضورؐ کی بعثت کا ایک بڑا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے۔ **وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ** (الاعراف: ۱۵۷) ''یہ پیغمبر ان کے بوجھ اتارتا ہے اور ان زنجیروں سے آزاد کرتا ہے جو انہوں نے اپنے گلے کا طوق بنا رکھی ہیں۔''

اسلام نے غلامی کے ادارے پر بھی حکیمانہ انداز سے ضرب کاری لگائی۔ ایک حدیث پاک میں ہے۔ ''اے معاذ! اللہ نے سطح زمین پر کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو غلام آزاد کرنے سے زیادہ اسے پسند ہو۔ اسی طرح روئے زمین پر کوئی چیز اس نے پیدا نہیں کی جو طلاق سے زیادہ اسے مبغوض ہو۔'' قتل ناحق کی سزا کے لئے ایک صورت یہ بھی رکھی گئی ہے کہ غلام آزاد کر دیا جائے۔ سید قطب شہیدؒ نے یہاں ایک بڑے پتے کی بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک آزاد کے قتل کی سزا کے طور پر ایک غلام کو آزاد کرنا بہت معنی خیز ہے۔ دراصل ایک آزاد آدمی کی زندگی کا خاتمہ ہونے سے جو کمی ہوئی ہے، اسلام کے نزدیک اس کی تلافی ایک غلام کو آزاد کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ گویا ''اسلام کے نزدیک آزادی عین زندگی ہے اور غلامی عین موت۔''

2۔ عہد جاہلیت میں جنگ کا کوئی ضابطہ اور قاعدہ مقرر نہ تھا۔ دشمن کے ہر فرد حتیٰ کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہجوں تک کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ لاشوں کی بے حرمتی کر کے آتش انتقام کو ٹھنڈا کیا جاتا۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک ہوتا ہے۔ دور جدید میں کچھ روشن دماغ ماہرین نے یہ رائے ظاہر کی کہ جنگ کے بھی حدود و آداب مقرر ہونے چاہئیں۔ بحث و تمحیص کے بعد جنیوا اور ہیگ کنونشنز میں کچھ اصول وضع بھی کئے گئے۔ لیکن دو عظیم جنگوں میں یہ اصول بن کھلے غنچوں کی طرح مرجھا کر رہ گئے۔ بین الاقوامی قانون کے ماہر پروفیسر نپولڈ (Nippold) کو کہنا پڑا۔

''جنگ کا کسی قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ جنگ میں قانونی تحفظات نہیں، جنگی تقاضے اہمیت رکھتے ہیں۔'' حضورؐ نے اپنی بہترین جنگی حکمت عملی سے جنگ کو ایک سائنس بنا دیا..... ایک ایسی

سائنس جس میں آرٹ کے جمالیاتی پہلوؤں کی خوبصورت آمیزش ہے۔ دوران جنگ بلاضرورت درختوں کو کاٹنے یا عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ اٹھانے سے حکماً روک دیا۔ فتح مکہ کے موقع پر تقریباً ہر شخص کو امان دی الا یہ کہ کوئی شخص خود ہی اپنی جان کا دشمن نہ ہو۔ خواجہ غلام السیدین کا یہ کہنا مبالغہ نہیں ''محسن انسانیتؐ نے جنگ کو بھی ایک تعلیمی ادارہ بنا دیا۔''

3۔ بعثت نبویؐ سے پہلے جنگیں نسلی، علاقائی اور لسانی بنیادوں پر لڑی جاتی تھیں۔ گزشتہ صدی میں بھی دو عظیم جنگیں نیشنلزم کے جذبہ سے لڑی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمی امن اور جارحانہ قوم پرستی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ حضورؐ چاہتے تو اپنی دعوت کے لئے عربی قومیت کا آسان سا نعرہ (Slogan) استعمال کر سکتے تھے۔ آپؐ قومیت پرستی کے راستے سے نہیں، اس کے مقابلے میں آگے بڑھے۔

واقعہ ہجرت سے یہ سبق ملتا ہے کہ اصولوں کے معاملے میں وطن مالوف کو ترک کر دینا بہتر ہے بہ نسبت اس سے کہ وطنیت پرستی کے لئے اصول چھوڑ دیئے جائیں۔ آپؐ نے تمام انسانوں کو بلا امتیاز نسل ایک اصولی دعوت پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ ملت واحدہ کے افراد قرار پائے۔ اس دعوت کی روح کو جنگوں میں بھی ملحوظ رکھا گیا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے: **من نصر قومه علی غیر الحق فهو کالبعیر الذی ردی فهو ینزع بذنبه** ''جو شخص کسی ناجائز معاملہ میں اپنی قوم کی مدد کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اونٹ کنوئیں میں گر رہا ہو اور یہ اس کی دم پکڑ کر لٹک گیا ہو تو یہ بھی اس کے ساتھ جا گرا۔'' (ابوداؤد)

4۔ زمانہ قدیم سے لے کر عہد جدید تک بالعموم سیاسی معاہدات کی حرمت کا پاس نہیں کیا گیا۔ سیکولر سیاست کے فکری امام میکیا ولی کی تعلیم ہے کہ ''بادشاہ کے لیے نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری کہ وہ اپنے عہد و پیمان پر اس وقت بھی قائم رہے جب ایسا کرنے سے نقصان پہنچتا ہو۔'' وہ کہتا ہے۔ ''عہد توڑنے کے لئے بادشاہ ہزار بہانے تلاش کر سکتا ہے۔'' حضورؐ کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی نہیں ملتا جب آپؐ نے سیاسی مصلحت (Reason of the State) کے نام پر معاہدات کی خلاف ورزی کو روا رکھا ہو۔ حضورؐ نے سیاسی قوتوں کیساتھ تاریخ ساز معاہدات کیے۔ میثاق مدینہ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی کی تحقیق کے مطابق دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور ہے۔ قبل ازیں معاہدہ حدیبیہ کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔ ہجرت کے نویں سال نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ ہوا اس میں انہیں مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ ان معاہدات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ سیاسی مسائل کو سیاسی پلیٹ فارم پر حل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ عہد شکنی کسی حال میں گوارا نہ تھی۔ معاہد قوم کے افراد کی حفاظت کے لئے سخت ہدایات جاری فرمائیں۔ ارشاد ہوا۔ ''جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے، اسے جنت کی خوشبو تک نصیب نہ ہوگی حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔'' اسلامی فوج اس دشمن کا تعاقب بھی نہیں کر سکتی جو بھاگ کر مسلمانوں کی معاہد قوم کے ہاں پناہ لے لے۔ فریق ثانی معاہدے کی خلاف ورزی کرتا تو آپؐ اسے وضاحت کا موقع یا اعلانیہ معاہدے کے خاتمے کا نوٹس دیتے۔ الغرض حضورؐ کے معاہدات نے دنیا میں نئے سیاسی فکر و نظر کی بنیاد رکھی۔

5۔ نبی اکرمؐ نے جو نظام حکومت قائم کیا، اس میں شورائیت کی روح پوری طرح موجود تھی۔ شورائیت کسی بھی معقول جمہوری نظام کی روح ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں اہل ایمان کی سات نمایاں صفات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے ان کا شمار اہل جنت میں ہوگا۔ ان میں سے ایک صفت ہے **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (الشوری:۳۸) ان کا ہر کام مشورے سے ہوتا ہے۔'' مشورے کا ذکر نماز اور انفاق کے درمیان ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شورائی نظام قائم کرنا نماز کی طرح

فرائض میں سے ہے۔سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم دیا **وَشَاوِرْ هُمْ فِی الْاَمْر**(آل عمران:۱۵۹)''ہر اہم معاملے میں ان سے مشورہ کیجئے۔'' حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔**مارئیت رجلًا اکثرا استشارۃ للرجال من رسول(ﷺ)**''میں نے ایسا شخص نہیں دیکھا جو رسول اللہؐ سے زیادہ لوگوں سے مشورہ کرنے والا ہو۔''ابن جریر، طبری، ابن جوزی، امام رازی، قرطبی اور علامہ آلوسی جیسے مفسرین کا کہنا ہے، رسول اللہؐ کو مشورہ لینے کا حکم اس لیے دیا گیا تاکہ امت میں شورائیت کی سنت قائم ہوجائے۔

آپؐ ہر غیر منصوص معاملہ میں مشورہ لیتے خواہ اس کا تعلق امور دینی سے ہو، جنگ سے ہو یا انتظامی معاملات سے۔غزوہ خندق کے موقع پر جب خندق کے پار دشمن کا دباؤ بہت بڑھ گیا تو آپؐ نے بنی غطفان کے سرداروں کے ساتھ مدینہ کے پھلوں کا ایک تہائی دے کر انہیں دشمن سے الگ ہونے کی پیشکش کی۔تاہم حتمی فیصلہ سے قبل آپؐ نے مشاورت کا اہتمام کیا۔انصاری سرداروں حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ نے کہا۔''اگر یہ اللہ اور رسولؐ کا حکم ہے تو سر تسلیم خم ہے۔ورنہ ہم اس مصالحت کے حق میں نہیں۔اہل غطفان ہم سے دور جہالت میں کچھ حاصل نہ کر سکے۔اب تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان کی دولت سے نوازا ہے۔''رسول اللہؐ نے فرمایا۔اگر یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا تو میں مشورہ کیوں کرتا۔''چنانچہ اس مشاورت کے بعد بنی غطفان سے مصالحت کے امکان کو مسترد کردیا گیا۔

6۔بین الاقوامی سیاسیات کا مسلمہ اصول ہے کہ سفیر امن وسلامتی کے پیامبر ہوتے ہیں۔ان کا تحفظ بین الاقوامی امن کا لازمی تقاضا ہے۔ المناک حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کے بعض انتہائی معتبر سفراء کو مخالف قبائل یا دشمن اقوام نے بے دردی سے شہید کر کے جنگ کے شعلوں کو دانستہ ہوا دی۔

نبی محتشمؐ سفراء کے ادب و احترام کا خاص خیال رکھتے۔مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کا سفیر جب اس کی طرف سے نبوت میں شرکت کا اشتعال انگیز پیغام لے کر پہنچا تو آپؐ نے اس قدر فرمایا۔''اگر سفیروں کا قتل منع نہ ہوتا تو میں تجھے قتل کر دیتا۔''اسلامی عہد اقتدار میں سفیروں کو بر بنائے عہدہ حکومت اور عوام کی طرف سے خاص تحفظ حاصل رہا ہے۔سید امیر علی کی تحقیق کے مطابق مستقل سفیروں کے تقرر کا آغاز یورپ سے دو سو سال پہلے مسلمانوں میں ہوا۔

آج اکیسویں صدی میں امریکی حکام کے ایماء پر افغانستان کے سابق سفیر ملا عبدالسلام ضعیف پر جو قیامت گزری اس کا اندازہ ان کی خود نوشت داستان''جرم ضعیفی''سے لگایا جاسکتا ہے۔رسوائے زمانہ امریکی فلم (the innocenc of Muslims) کے خلاف لیبیا میں ہونے والے پر تشدد عوامی مظاہروں کے دوران امریکی سفیر کرسٹوفر سٹیونز کی ہلاکت بھی اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً بلا جواز اور سراسر غیر ذمہ دارانہ اقدام ہے۔

7۔حضورؐ کی جملہ سیاسی مساعی کا محور عالمی امن کا قیام تھا۔ اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے دس سال کے قلیل عرصے میں آپؐ نے مثالی امن قائم کردیا۔بیرونی ممالک کے سربراہوں کو آپؐ نے جو دعوتی خطوط لکھے، ان میں بھی صاف صاف فرمایا۔'' اسلام قبول کرلو سلامتی میں آجاؤ گے۔'' تاہم امن کے نام پر ظالم و مظلوم میں بقائے باہمی کا وہاں کوئی تصور نہ تھا۔حضورؐ نے بعثت سے قبل بھی معاہدہ حلف الفضول میں شرکت فرمائی۔اس معاہدے کی ایک اہم شق یہ تھی کہ مکہ میں جو بھی مظلوم نظر آئے خواہ وہ مکہ کا باشندہ ہو یا کسی اور جگہ کا، سب اس کی حمایت اور اعانت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس کا حق دلا کر رہیں گے۔رسول اللہؐ بعثت کے بعد فرمایا کرتے تھے۔'' میں عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدے میں شریک تھا کہ مجھے اس کے عوض سرخ اونٹ بھی پسند نہیں اور اگر (دور) اسلام میں اس عہد و پیمان کے لئے مجھے بلایا جاتا تو میں لبیک کہتا۔''

8۔اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک بین الاقوامی دنیا کے لیے پیغمبر انقلاب ؐ کا ایک اور عطیہ ہے۔اقلیتوں سے ایک ہی خواہش کی گئی تھی کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ؐ کے خلاف کسی سازش میں شریک نہ ہوں۔عرب کے یہودیوں نے پے در پے اس اصول کو بری طرح پامال کیا۔اب یہ خواہش ہی کی جاسکتی ہے کاش وہ ایسا نہ کرتے اور ظاہر ہے خواہشات سے سیاسی حقیقتیں تبدیل نہیں ہوتیں۔انہوں نے ہر وہ کام کیا جو بادشاہ کے خلاف جنگ (Waging War against the King) اور انہدام ریاست (Dilapidation of the state) کے زمرے میں آتا ہے۔

جہاں جہاں یہود و نصاریٰ اور دوسری اقلیتوں نے ریاست کے بنیادی اصولوں کا احترام کیا وہ ہر طرح کے احترام اور تحفظ کے مستحق ٹھہرے۔خود اقلیتیں بھی اسلامی ریاست میں پوری طرح مطمئن تھیں۔رومی شہنشاہ کانسٹنٹائن نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی باہمی آویزش کے دنوں میں مسلم مملکت کے عیسائیوں کو خفیہ ایلچی بھیج کر بغاوت پر اکسایا۔انہیں یقین دلایا گیا کہ اگر آپ لوگ بغاوت کردیں تو شہنشاہ کی فوج بھی حملہ کر کے اس جنگ کو منطقی انجام تک پہنچا دے گی۔مگر ان عیسائیوں نے جو کہ ان رومی حکمرانوں کی سابق رعایا تھے، جواب دیا کہ وہ مسلمانوں کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔

الغرض حضورؐ نے عصری سیاست کو بین الاقوامی سیاسیات کے دائمی تقاضوں سے آشنا کردیا۔

☆☆☆

طیب اردگان کا ترکی

نجم الدین اربکان نے جب 1969ء میں باقاعدہ سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو ان کا ہدف ترکی کا نوجوان خون تھا۔ سیاسی جماعت کی بنیاد رکھنے سے پہلے ہی انہوں نے دس برس نوجوان ذہن کو ایک پُرامن انقلاب کے لیے تیار کر دیا تھا۔

اپنی پہلی جماعت کی بنیاد جب انہوں نے رکھی تو ایک متحرک نوجوان نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ یہ نوجوان ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ مرمر یونیورسٹی میں بزنس ایڈمنسٹریشن کا اسٹوڈنٹ تھا۔ تعلیمی اوقات کے علاوہ اس کی دو مصروفیات تھیں، یا تو وہ فٹ بال ٹورنامنٹس میں استنبول کے کسی لوکل کلب کی نمائندگی کرتا یا پھر استنبول کے فٹ پاتھ پر ال کے کسی لوکل کلب کی نمائندگی کرتا یا پھر استنبول کے فٹ پاتھ پر اخبار بیچ کر گزر اوقات کا سامان کرتا۔ دوسرے اخبار فروشوں میں اور اس میں فرق یہ تھا کہ اخبار فروشی سے زیادہ اخبار بینی کرتا۔ حالات سے وہ مکمل طور پر باخبر ہی نہیں تھا بلکہ حالات پر اس کی نظر بھی بہت گہری تھی۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ استنبول میں ایک کامیاب فٹبالر کی حیثیت سے اس کی شناخت ہونے لگی۔ اس کو ایک ذہین اور چالاک کھلاڑی کے طور پر جانا جاتا تھا۔ جلد ہی اس نے فٹ بال ٹیم کی قیادت بھی شروع کر دی۔ فٹ بال کے میدانوں میں اس کی کارکردگی دیکھ کر ترکی کے ہر بڑے کلب نے اس نوجوان سے کلب میں شمولیت اختیار کر کے ایک پیشہ ور کھلاڑی بننے کی پیش کش کی مگر اس نوجوان نے ایسی آفرز کو ٹھکرا دیا، شاید وہ اس سے بلند منزل کی تلاش میں تھا۔

فٹ بال کے شوق میں مست اس متحرک نوجوان کی شرافت، ایمان داری، سچائی اور خودداری نے نجم الدین اربکان کو سوچنے پر مجبور کیا کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ دوسری طرف اخبار بیچنے والے اس نوجوان کو اخباروں میں نیشنل وائس پارٹی اور نجم الدین اربکان کی خبروں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اربکان نے جب تحریک اٹھائی تو ان کے وابستگان نے اس نوجوان کو بھی دعوتِ فکر دی۔ پہلی ہی ملاقات میں نوجوان نے محسوس کر لیا کہ جس چیز کی مجھے تلاش تھی وہ چل کر میرے پاس آ گئی ہے۔ اس نے فٹ بال کا شوق ترک کر دیا اور اخبار کا دھندا جاری رکھا۔ فٹ بال کا وقت اس نے نظریاتی اور فکری جدوجہد کو دیا۔ اس نے ترکی میں سیکولر قوتوں کے مقابلے کے لیے یکسوئی کے ساتھ کمر کس لی۔ جلد ہی وہ ترکی کی آواز بن گیا۔ دبی ہوئی آوازوں کو اس نے حوصلہ دیا۔ دکھے دلوں کی اس نے ترجمانی کی۔ آگے چل کر اس کی جدوجہد ترکی کی ایک تاریخ بن گئی اور ترکی نے وہ دن بھی دیکھ لیا کہ استنبول کی سڑکوں پر اخبار بیچنے والا وہی شخص خود اخباروں کی زینت بن گیا۔ اب وہ لیڈر اور سپر لیڈر ہے۔ وہ کون ہے؟ وہ ترکی کا آج کا وزیراعظم رجب طیب اردگان ہے۔

طیب اردگان نے اپنی تحریکی زندگی کا آغاز کمیونسٹ مخالف تنظیم ترکش اسٹوڈنٹ موومنٹ سے کیا۔ اس دوران نجم الدین اربکان کی تنظیم نیشنل وائس پر پابندی لگ چکی تھی۔ اربکان نے جب سالویشن پارٹی کی بنیاد رکھی تو طیب اردگان نے اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ اسی پارٹی میں یوتھ ونگ اور استنبول کے صدر رہ کر وہ کمیونسٹ سرکل کے لیے زہر یلا نشتر بنے رہے۔ 1980ء کی فوجی بغاوت کے بعد اربکان کی دوسری جماعت پر پابندی لگی تو رفاہ پارٹی کی بنیاد پڑ گئی۔ اس رفاہ پارٹی کو اڑان دینے میں طیب اردگان نے کلیدی کردار ادا کیا۔ دس برس تک رفاہ پارٹی میں وہ مختلف اہم ذمہ داریوں پر رہے۔

رفاہ پارٹی میں ہی اردگان کا پہلا تعارف عبداللہ سے ہوا۔ اس

ملاقات نے عدنان مینڈریس اور جلال بایار کی طرح ترکی کے مسلمانوں کو ایک اور تاریخ ساز جوڑی مہیا کر دی۔ طیب اردگان نے 1994ء کے بلدیاتی انتخابات میں رفاہ پارٹی کی طرف سے حصہ لیا۔ کانٹے کے مقابلے کے بعد اردگان استنبول کے ناظم منتخب ہوگئے۔ اردگان ناظم کیا منتخب ہوئے استنبول کی سیکولر قیادت سناٹے میں آ گئی۔ انہیں تشویش ہوئی کہ طیب اردگان اب استنبول میں مذہبی ترجیحات کو مسلط کرنے کی کوشش کرے گا۔ وزیراعظم اربکان سے مل کر وہ مخالفین کو انتقام کا نشانہ بنائے گا۔ جبکہ انہوں نے ان تمام خدشات کے برعکس میئر کی نشست سنبھالتے ہی بنیادی مسائل کا ادراک کیا۔ بنیادی طور پر تین بڑے مسائل ان کے سامنے تھے۔ پانی کی ترسیل اور تحفظ کا نظام ناقص ہونے کی وجہ سے پانی کی کمی کی شکایت تھی۔ آلودگی نے استنبول کے ماحول کو بری طرح متاثر کیا ہوا تھا۔ ٹریفک کے سنگین مسائل استنبول کے لیے بہت بڑا چیلنج بنے ہوئے تھے۔

پہلا کام ہی طیب اردگان نے یہ کیا کہ سو کلومیٹر کی ایک نئی پائپ لائن بچھا کر پانی کی شکایت ختم کر دی۔ کوڑا کرکٹ اور غلاظتوں کے ڈھیر سے نجات کے لیے ایمرجنسی بنیادوں پر ری سائیکلنگ کا کام شروع کر دیا۔ ٹریفک کے اژدہام سے نکلنے کے لیے استنبول شہر میں اردگان نے پچاس سے زیادہ پل تعمیر کروائے۔ ہائی ویز کی تعمیر اس قدر تیزی کے ساتھ شروع ہوئی کہ استنبول میں ترقیاتی کاموں کے اگلے پچھلے سب ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ بھاری ٹرانسپورٹ کا لوڈ شہر کی خارجی شاہراہوں پر شفٹ کر دیا۔

ساتھ ہی اردگان نے بنیادی ترین کام یہ کیا کہ کرپشن کے خاتمے کے لیے ایسے اقدامات کیے کہ استنبول ترکی کے باقی شہروں کے لیے مثال بن گیا۔ ترقیاتی فنڈز کی نگرانی کے لیے اردگان نے باقاعدہ ایک کمیٹی قائم کی، جس کا کام صرف فنڈز پر چیک رکھنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صرف تین برسوں میں اردگان نے استنبول شہر کی ترقی پر نہ صرف یہ کہ چار بلین ڈالر لگائے بلکہ دو بلین ڈالر کا قرضہ بھی مالیاتی اداروں کو لوٹا دیا۔ شہر میں قلت آب کی شکایت ختم ہوگئی، گندگی اور آلودگی کا نام و نشان مٹ گیا، سڑکیں کشادہ ہوگئیں۔ بیرون ملک سے ہزاروں نایاب پودے منگوا کر استنبول کو سولہ سنگھاری دلہن بنا دیا۔ فیملی پارکوں کا ایک جال پورے شہر میں بچھا دیا۔ استنبول دنیا کا ایک خوبصورت ترین شہر بن گیا۔ دنیا بھر کے سیاح استنبول کی طرف متوجہ ہوئے، غیر ملکی سرمایہ کار سرمایہ لے کر استنبول پہنچنے لگے، شہریوں کے تمام بنیادی مسائل حل ہوگئے، شہر کے کندھوں سے قرضوں کا بوجھ اتر گیا، اردگان پر عوام کا اعتماد بڑھ گیا۔ دنیا کے پانچ بڑے میئرز میں ان کا نام شامل ہوگیا۔ جب یہ سب ہوگیا تب جا کر طیب اردگان نے استنبول میں سرعام شراب فروخت کرنے پر پابندی عائد کر دی۔

طیب اردگان 1997ء تک استنبول کے میئر (ناظم) رہے۔ اسی سال وزیراعظم نجم الدین اربکان کی حکومت پر شب خون مار کر رفاہ پارٹی کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ جماعت پر پابندی لگی تو سب سے زیادہ مزاحمت طیب اردگان نے ہی کی۔ ملک بھر میں ہونے والے مظاہروں میں ہونے والی طیب اردگان کی سحر انگیز تقریروں نے نوجوانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ خوش پوش و خوش جمال ہونے کے ساتھ طیب اردگان بہت خوش آواز بھی ہیں۔ وہ جلسوں میں تقریروں کے ساتھ ساتھ نغمے اور ترانے بھی گاتے تھے۔ استنبول کے ایک جلسے میں انہوں نے مسلم شناخت سے متعلق نظم پڑھ کر نوجوانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نظم کو اشتعال انگیز مواد قرار دے کر اردگان کو گرفتار کر لیا گیا کیونکہ ترکی اپنے آئین کے اعتبار سے ایک سیکولر ملک ہے اگرچہ آبادی کے لحاظ سے ایک مسلمان ملک ہے اور ملت اسلامیہ کی شاندار تاریخ کا حامل بھی۔ دس ماہ تک جیل میں رہنے کے بعد وہ رہا تو ہوگئے مگر اسی نظم کی پاداش میں اردگان پر انتخابی سیاست میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی گئی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب سیکولر قوتوں کی تنگ ظرفی و تنگ نظری نے اردگان کو دل گرفتہ کر دیا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ استنبول جیسا شہر تعمیر کرنے کے بعد بھی یہ صلہ کیوں دیا جاتا ہے کہ صرف ایک نظم کو ناقابل معافی جرم بنا دیا جائے۔ یہی دکھ عبداللہ گل بھی اپنے سینے میں لئے پھر رہے

تھے۔ناکردہ جرم کی سزائیں جھیلتے جھیلتے حالت یہی ہوجاتی ہے جوان دنوں اردگان اورعبداللہ گل کی تھی۔دونوں نے بیٹھ کرخیالات کا تبادلہ کیا ۔دونوں اس بات پرمتفق ہوئے کہ ہماری ایمان داری کے چرچے ہیں ،ہم بددیانت اور بدعنوان نہیں ہیں،ہم عدل وانصاف کے ہرتقاضے کو پورا کرتے ہیں ،جمہوری روایتوں کو ہم فروغ دیتے ہیں ،ذاتی مفادات سے ہم بالاتر ہیں،ہم نے عوام کی جس طرح خدمت کی وہ ایک مثال ہے۔مگرایک ہی ہمارا جرم ہے اوروہ مذہب ہے۔ہم ہر بار نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں،جوں ہی اڑان کے قابل ہوتے ہیں ہمارے پرکاٹ دیے جاتے ہیں ۔کیا ہم یہی تماشہ دیکھتے رہیں گے کہ سرکار جماعتوں پر پابندیاں لگائے گی اور ہم نئی جماعتوں کی بنیاد رکھیں گے ؟سوہمیں اپنی پالیسی پرغور کرنا ہوگا۔ہمیں فی الوقت سیاست میں مذہب کے نام کو بالکل ترک کردیناہوگا۔ہمیں رات دن ایک کرکے مذہب پسندوں کے علاوہ لبرل عوام کا اعتماد بھی حاصل کرنا ہوگا۔ہمیں ایک لبرل نام کے ساتھ سیاست میں حصہ لے کرانتخابات میں بھاری اکثریت کو ہدف بنانا ہوگا۔مگر بھاری اکثریت کے بعد بھی مذہب کے بجائے ترکی کوترقی دینے پرزور دیناہوگا۔لوگوں کی زندگی کا معیار بلند کرکے خود کوترکی کے لیے ناگزیر بنانا ہوگا۔اتنی طاقت حاصل کرنا ضروری ہے ،جس کی بنیاد پر ہم سیکولرفوج اورعدالتوں پر ہاتھ ڈال سکیں،سیکولرفوج اور ربراسٹمپ عدالتوں کے شکنجے کے بغیر ہم سیکولر آئین پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔سوپہلی ترجیح ترقی یافتہ ترکی ہونی چاہیے۔اس کے بعدفوج اوراس کے بعدسیکولرآئین۔

طیب اردگان اورعبداللہ گل نے اپنے ان خیالات کوورچو پارٹی کی قیادت کے سامنے رکھا۔اکثریت نے اردگان کی تھیوری سے اتفاق کیا مگراعلیٰ قیادت میں اس سوچ کو پذیرائی نہیں مل سکی۔تمام ترکوششوں میں ناکامی کے بعدطیب اردکان اورعبداللہ گل نے اپنے ساتھیوں سے مل کر 2001ء میں ایک الگ جماعت جسٹس اینڈ ڈیولیمنٹ پارٹی (انصاف وترقی پارٹی) کی بنیادرکھدی۔طیب اردگان نے اپنی جماعت کوایک لبرل جماعت کےطور پرمتعارف کروایاانہوں نے اپنے اورعوام کے بیچ حائل ہر دیوارکو پوری حکمت اورتدبر کے ساتھ گرادیا اورظاہر ہے نجم الدین اربکان کی جماعت سے ان کی علیحدگی کو اسی نظر سے دیکھا جارہا تھا کہ یہ لوگ درحقیقت ماڈرن سیاست پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی میں ہر رنگ اورنسل کے لوگوں کو ذمہ داریاں دی گئیں۔نظریات کے تفاوت کوایک حدتک برداشت کرکے لوگوں کو جماعت میں شامل کیا گیا۔بس ایک معیار رکھا کہ قیادت اوپر سے نیچے تک ایمان داری،دیانت اورعوامی خدمت کی شہرت رکھنے والی ہو۔

طیب اردگان خودتو انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے تھے مگراپنے مہولوں کو دنیائے سیاست کے شہبازوں سے لڑانے کے لیے انتخابی مہم میں اتاردیا۔سیکولرقوتوں کا خیال یہ تھاصرف ایک برس کی نوزائیدہ جماعت انتخابات میں کیا گل کھلائے گی مگر 2002ء کے انتخابات میں جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی اتری تو دوتہائی اکثریت حاصل کرکے مصطفیٰ کمال اورعصمت انونو کی روح کوتڑپادیا۔ترکی فوج سکتے میں آ گئی ۔ریموٹ کنٹرول عدل گاہیں لرز گئیں۔سیکولر راہنماؤں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے ۔ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ۔دوتہائی اکثریت کی کامیابی نے طیب اردگان کی سوچ کو درست ثابت کردیا۔پھر 2004ء کے بلدیاتی انتخابات میں بھی جسٹس پارٹی نے جھاڑو پھیر دی ۔معاشی انقلاب کے نتیجے میں 2007ء کے عام انتخابات میں جسٹس پارٹی نے ایک بار پھر بھاری اکثریت حاصل کرلی ۔معاشی انقلاب کو تسلسل دیا۔ترکی کی تاریخ کی بے مثال ترقی شروع ہوئی ۔اسی لیے 2009ء کے بلدیاتی انتخابات میں بھی جسٹس پارٹی نے ایک بار پھر مخالفین کودھودیا۔ایک مضبوط ٹریک ریکارڈ کے ساتھ جسٹس پارٹی 2011ء کے عام انتخابات میں گئی اورایک بار پھردوتہائی اکثریت کے ساتھ ایوان نمائندگان میں پہنچ گئی۔

جسٹس پارٹی کاعہد اقتدار مجموعی طور پر گیارہ برسوں پر محیط ہے۔ہرمدت کا الگ سے جائزہ لینا مشکل ہوگا۔ہم مجموعی کارکردگی کا جائزہ پیش کیے دیتے ہیں۔ایک عوامی جلسے میں اسلامی نظم پڑھنے کی

وجہ سے طیب اردگان پر تو انتخابی سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کردی گئی تھی لہٰذا 2002ء کے انتخابات میں وہ حصہ نہیں لے سکے۔جسٹس پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو عبداللہ گل وزیراعظم منتخب ہوئے۔پہلے ہی سال عبداللہ گل نے ری پبلکن پیپلز پارٹی کے تعاون سے آئین میں ایک ترمیم کے ذریعے طیب اردگان پر سے پابندی اٹھوادی۔2003ء میں استنبول میں اردگان کے حلقے سے ضمنی انتخابات کا اعلان کردیا گیا۔طیب اردگان ایوان میں پہنچے اور عبداللہ گل نے وزارت عظمیٰ کے منصب سے دستبردار ہونے کا اعلان کردیا۔

ترکی کے مرد آہن طیب اردگان نے وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالا اور یورپ کے مرد بیمار کی دوا کرنے لگے۔ترکی کو یورپ کا مرد بیمار کیوں کہا گیا؟ کیونکہ یورپ آج سے صرف بارہ برس پہلے تک معاشی زبوں حالی کا شکار تھا۔بڑھتی ہوئی مہنگائی نے شہریوں کا جینا دوبھر کیا ہوا تھا،فوج سے لے کر پولیس تک ہر ادارے کے در و بام پر کرپشن کا شیش ناگ پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ٹیکس چوری کی وبا نے ترکی کو لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔مارکیٹ کی رگوں میں ملاوٹ کا ناسور دوڑ رہا تھا۔شہریوں کی سہولیات اور ان کے حقوق تقریباً معطل ہو چکے تھے۔ترکی کی کمر آئی ایم ایف کے انیس قرضوں کے بوجھ نے دہری کردی تھی۔یورپ کے اس مرد بیمار کا علاج طیب اردگان جیسے کیمیاگر کے پاس ہی تھا۔اس کا علاج خلوص،محنت،ایمانداری،عدل وانصاف اور حب الوطنی ایسے نسخوں میں پوشیدہ تھا۔

طیب اردگان نے پہلے مرحلے میں منہ زور سرکاری اخراجات کو لگام ڈالی۔وزرا کو سادگی کی مثال قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ٹیکس چوری کی وبا روکنے کے لیے اردگان نے اشرافیہ پر ٹیکس کے قوانین سختی سے لاگو کیے۔اضافی اخراجات کنٹرول ہوتے ہی جسٹس پارٹی کے چارہ سازوں نے کرپشن پر ہاتھ ڈالا۔صرف دو سال کے عرصے میں ترکی کے جسم سے کرپشن کا ناسور الگ کرکے پھینک دیا گیا۔کرپشن کے صرف مردہ جراثیم رہ گئے تھے جن کا صفایا بقیہ گیارہ برسوں میں کردیا گیا۔مرد بیمار بستر سے اٹھ کر چہل قدمی کے قابل ہوگیا۔صرف چار برسوں میں خسارے کا بجٹ منافع کے بجٹ میں بدل گیا۔اردگان نے اپنے وزیر خزانہ علی بابکان کو طلب کرکے کہا کہ غیر ملکی سرمایہ کار کی توجہ ترکی کی مارکیٹ کی طرف کھینچنے کے لیے جس حد تک بھی پالیسی کو بدلنا پڑے بدلیں۔اس طرح یورپ کا بڑا سرمایہ بہت تیزی کے ساتھ ترکی میں داخل ہونا شروع ہوا۔مرد آہن کا یہی انجکشن تھا جس نے مرد بیمار کے رگ و پے میں بجلی چھوڑ دی۔عالمی منڈیوں میں ترکی چہل پہل کرنے لگا۔

ترکی تیزی سے روبصحت ہوا مگر ابھی قرضوں کے بوجھ نے اسے گردن توڑ بخار میں مبتلا کر رکھا تھا۔سو اردگان نے آئی ایم ایف کو قرضوں کی پہلی قسط ادا کی تو ترکی کا بخار کنٹرول ہوگیا۔اسے امید ہو چلی کہ رات دن گردش میں ہیں۔مہنگائی جو ترکی کے لیے آدھے سر کا درد بنی ہوئی تھی اس کا بھی زور ٹوٹنا شروع ہوا۔اشیا کے نرخ کم ہونے لگ گئے۔وہ وقت آیا کہ خالی جیب گھومنے والا مرد بیمار خیرات بانٹنے لگا۔ترکی میں فی کس آمدنی دگنی سے بھی تجاوز کرگئی۔اردگان کے تیسرے دور کے آغاز میں ترکی نے 134.6 ارب ڈالر کی مصنوعات برآمد کرکے عالمی منڈی میں حیرت کی ایک لہر دوڑا دی،۔اسی کے ساتھ اردگان نے قرضوں کی آخری قسط بھی آئی ایم ایف کے منہ پر مار کر مرد بیمار کو عالمی معیشت کے اکھاڑے میں ایک معاشی پہلوان کے طور پر اتار دیا۔ساڑھے سات کروڑ کی آبادی والا ترکی اب دنیا کی پندرہویں بڑی معاشی قوت بن کر ابھرا۔اس وقت ترکی دنیا کے ان دس بڑے ممالک میں شامل ہے جن کی ترقی کی شرح سب سے زیادہ ہے۔آئی ایم ایف جیسا ادارہ ترکی سے پانچ سو ارب کا قرضہ لینے پر غور کررہا ہے۔

دنیا کا کوئی بھی انقلاب یا تبدیلی تعلیمی انقلاب کے بغیر دیرپا ثابت نہیں ہوسکتی۔اس حقیقت کو اخبار اور شربت بیچ کر تعلیم حاصل کرنے والے اردگان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔طیب اردگان نے جب ترکی کا اقتدار سنبھالا تو تعلیمی بجٹ 7.5 بلین تھا۔اردگان نے یہ بجٹ بڑھا کر 34 بلین کردیا۔اردگان نے فوج ہی کے بجٹ میں کٹوتی کرکے تعلیمی بجٹ کو بڑھادیا۔2003ء میں طیب اردگان نے یونائیٹڈ نیشن چلڈرن فنڈ (UNICEF) کے تعاون سے Come on Gilr's Go

To School (آؤ بچیو! چلواسکول چلیں) عنوان سے ایک مہم چلائی جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی میں نسلی اور صنفی امتیاز کے بغیر تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ 2004ء میں ترکی میں کورس (نصابی کتاب) مکمل فری کر دیا گیا۔ 2006ء تک ترکی بھر میں ایسا کوئی صوبہ نہیں تھا جو یونیورسٹی کے معاملے میں خود مختار نہ ہو۔ اردگان کے دور تک ترکی میں جتنی یونیورسٹیاں تھیں اس کا موازنہ اگر اب جمہوریہ ترکی کی مجموعی یونیورسٹیوں سے کیا جائے تو یہ دوگنی تعداد بنتی ہے۔ اس تعلیمی انقلاب نے ترک شہریوں کے دلوں پر لگے اس آخری تالے کو بھی توڑ دیا جو مذہب پسند اور لبرل عوام کے بیچ حائل تھا۔ اب ترکی نے طیب اردگان کو اپنی دھڑکنوں میں بسا لیا ہے۔

ترکی کے گزشتہ دس برسوں میں ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیا جائے تو حیرانگی بڑھتی جاتی ہے۔ اردگان برسر اقتدار آیا تو ترکی میں کل 26 ائیر پورٹ تھے اور آج 50 ائیر پورٹ ہیں۔ یوں کہا جائے کہ 70 برسوں میں جہاں 26 ائیر پورٹ تعمیر ہوئے وہاں صرف دس برسوں میں 24 ائیر پورٹ بنائے گئے۔ محنت اور ترقی کی رفتار دیکھنے کے لائق ہے۔ اسی طرح جمہوریہ ترکی کے قیام 1923ء سے 2003ء تک ترکی میں 6 ہزار کلومیٹر پر مشتمل ایکسپریس وے تعمیر ہوئی۔ عالمی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق ایکسپریس وے کی اس تعمیر کے بعد روڈ حادثات میں ساٹھ فیصد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ ترکی کی تاریخ میں پہلی بار تیز رفتار ریلوے لائنیں بچھائی گئیں۔ 2008ء میں پہلی مرتبہ بلٹ ٹرین کی سروس شروع کی گئی۔ آبنائے باسفورس میں سمندر کی تہہ میں جا کر ایک ریلوے ٹنل کی تعمیر کا آغاز بھی کر دیا گیا ہے۔ تعمیر کے بعد یہ زیر سمندر دنیا کا سب سے گہرا ترین ریلوے ٹنل ہوگا۔

اردگان نے تمام تر سیاسی اور معاشی زنجیروں کو توڑ کر ترکی کو ایک آزاد خوددار و خودمختار ریاست بنا دیا۔ ترکی نے اپنے سر پر لٹکی ہوئی مغربی بلاگ کی تلوار بھی توڑ ڈالی ہے۔ 2008ء میں اسرائیل نے غزہ کی پٹی پر جارحیت کا مظاہرہ کیا۔ اردگان نے فوری کمیٹی تشکیل دی اور پھر پورانداز میں احتجاج ریکارڈ کروا کر اسرائیل کی طبیعت ستھری کر دی۔ ترکی نے اسرائیل کو دوٹوک الفاظ میں اقتصادی بائیکاٹ کی دھمکی دی۔ اسی سال ڈیوس عالمی اقتصادی فورم میں اردگان نے دلائل کے ساتھ اسرائیل کو چیلنج کیا۔ فورم میں خطاب کے دوران اردگان کا مائیک بند کر دیا گیا۔ بات کاٹنے پر اردگان نے اجلاس کا بائیکاٹ کیا اور پہلی فلائٹ سے ترکی لوٹ گئے۔

پھر 2014ء میں ترکی سے غزہ کے محصورین کے لیے امدادی سامان لے جانے والے ''فریڈم فلوٹیلا'' پر اسرائیلی فوج نے حملہ کر دیا۔ حملے میں 9 ترک شہری شہید ہوئے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد اردگان نے اسرائیل کو اوقات دکھادی۔ ترکی نے اقتصادی بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اسرائیل کی مصنوعات پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تمام شعبوں میں جاری تعاون کو منسوخ کر دیا۔ اردگان نے اپنے نو شہیدوں کا خود استقبال کیا اور جنازوں میں شرکت کی۔ اردگان نے اعلان کیا کہ اس بربریت پر اسرائیل کو ترکی سے باضابطہ معافی مانگنی ہوگی۔ بصورت دیگر حالات جوں کے توں رہیں گے۔ کچھ عرصے کی آئیں بائیں شائیں کے بعد اسرائیل کی اکڑفوں نکل گئی اور اس نے ترکی کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ اسرائیل نے باضابطہ معافی مانگ لی مگر اردگان نے یہ معافی بھی اس وقت تک قبول نہیں کی جب تک حماس کے اسماعیل ہانیہ، خالد مشعل اور مصر کے صدر محمد مرسی کو اعتماد میں نہیں لے لیا۔

اردگان کی سربراہی میں ترکی نے ہمیشہ عرب دنیا میں ڈکٹیٹروں کی بجائے عوامی قوتوں کی حمایت کی۔ شام میں بشار الاسد کے مظالم کا شکار ہونے والے 2 لاکھ شامی مہاجرین کو ترکی میں پناہ دے رکھی ہے۔ میانمار میں جب مسلمانوں پر ظلم ہوا تو پورے عالم اسلام کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔ واحد ایک اردگان تھا جس نے ترکی وزیر خارجہ کو اپنی اہلیہ کے ہمراہ میانمار کے مسلمانوں کی اشک شوئی کے لیے بھیجا، مصر کے اندر مرسی کی جمہوری حکومت کو معزول کرنے پر ترکی کا جرات مندانہ موقف سامنے آیا جس میں انہوں نے صدر مرسی کو بحال کرنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ہم مرسی کو مصر کا قانونی صدر سمجھتے ہیں۔ اس پوری صورتحال نے اردگان کو عالم اسلام کا قدآور رہنما بنا دیا ہے۔ عرب میڈیا نے طیب

اردگان کو قائد فقطر کا خطاب دیا۔یکم جون 2013ء کو ترکی میں ہونے والے مظاہروں کو عالمی میڈیا نے بڑے پیمانے پر طیب اردگان کے خلاف پراپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا۔

امریکی روزنامہ نیویارک ٹائمز نے سوشل میڈیا پر Gezi Park Fund کے عنوان سے پانچ روزہ ایک مہم چلائی جس کا مقصد گیزی پارک کا تحفظ کے حوالے سے ایک اشتہار شائع کرنے کے لیے فنڈ اکٹھا کرنا تھا۔صرف پانچ دن میں اس اشتہار کے لیے ایک لاکھ دو ہزار ڈالر کی بھاری رقم جمع ہوئی۔نیویارک ٹائمز کے 7 جون کے شمارے میں ایک فل سائز اشتہار کے ذریعے عالمی طاقتوں کو ترک حکومت کے خلاف اُکسایا گیا۔عالمی ذرائع ابلاغ نے عالمی قوتوں کو اُکسانے کے لیے یہ موقف اختیار کیا ہے۔گیزی پارک میں دراصل عثمانی دور کی ایک بیرک قائم ہے جس کو اردگان از سرنو تعمیر کرنا چاہتا ہے۔اپنے موقف کو موثر بنانے کے لیے نیویارک ٹائمز نے دانستہ گیزی پارک کو غازی پارک بنادیا تاکہ اس پورے معاملے کو ترقیاتی منصوبے کی بجائے ایک مذہبی ایشو ثابت کیا جاسکے۔

اس معاملے میں حقیقت یہ ہے کہ ترک حکومت نے جو ترقیاتی منصوبے شروع کیے ہیں ان میں گیزی پارک کے ساتھ واقع گزرگاہ بھی شامل ہے جہاں سے لاکھوں لوگوں کے ساتھ ٹریفک کا گزر بھی ہوتا ہے۔ٹریفک کو زیرزمین منتقل کرکے اس مقام کو پیدل چلنے والوں کے لیے مختص کرنا اور ساتھ وہاں ایک تجارتی مرکز اور ایک جامع مسجد کی تعمیر کا منصوبہ ہے۔15 جون کو لاکھوں افراد سے طیب اردگان نے مخاطب ہوکر کہا آپ کو معلوم ہے انہوں نے یکم جون سے یہ ہنگامہ آرائی کیوں شروع کی ہے،اس لیے کہ مئی میں ہم نے کئی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ترکی اور ترکی عوام کے دشمنوں کو یہ کامیابیاں ہضم نہیں ہورہی ہیں۔ہم نے مئی میں آئی ایم ایف کے قرضوں کی آخری قسط (412 ملین ڈالر) بھی ادا کردی۔ہم جب برسراقتدار آئے تھے تو ترکی پر آئی ایم ایف کا ساڑھے 23 ارب ڈالر (تقریباً ساڑھے 23 کھرب روپے) کا قرض تھا،ہم نے نہ صرف وہ قرض چکادیا ہے بلکہ اب آئی ایم ایف ہم سے قرض مانگ رہا ہے۔جب برسراقتدار آئے تھے تو سود کی شرح 63 فی صد ہوچکی تھی،اب یہ شرح 4.6 فیصد پر آگئی ہے۔ہم نے ان کے یہ ذرائع آمدن مسدود کردیے ہیں تو ان کو تشویش اور تکلیف ہورہی ہے کہ ترکی ان کی گرفت سے آزاد ہوگیا ہے۔ہم نے استنبول میں 42 ارب ڈالر کی مالیت سے ایک عظیم الشان ائیرپورٹ کی تعمیر کا آغاز کردیا ہے۔گزشتہ ماہ انقرہ میں جاپانی وزیراعظم کے ساتھ 22 ارب ڈالر کی مالیت سے ایک ایٹمی بجلی گھر کی تعمیر کا معاہدہ کیا ہے۔براعظم ایشیا اور یورپ کو ملانے کے لیے آبنائے باسفورس کے اُوپر ایک تیسرے پل کی تعمیر کا کام شروع کردیا ہے جس پر اڑھائی ارب ڈالر لاگت آئے گی۔

ترکی میں اقتصادی ترقی کا جو سفر شروع ہوا ہے اس کی بنا پر 2015ء میں ترک اخبارات وجرائد نے جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کے مسلسل تیسری بار کامیابی حاصل کرکے حکومت سازی پر اس کے سربراہ رجب طیب اردگان کو ترکی کی کانجات دہندہ اور پرآشوب ادوار میں ترکی کو بحرانوں سے نکالنے پر کمال اتاترک کے بعد ترک تاریخ کا مقبول ترین رہنما قرار دے دیا ہے۔میڈیا رپورٹس کے مطابق کمال اتاترک کے بعد ایسی پذیرائی کسی رہنما کو حاصل نہیں ہوئی۔جب کہ عالمی نیوز ایجنسی اے ایف پی نے ایک تجزیہ میں رجب طیب اردگان کی انتخابی فتح پر لکھا ہے کہ ترکی ایک بار پھر فتح یاب ہوگیا۔برطانوی اخبار ،ڈیلی میل آن لائن کے مطابق رجب طیب اردگان کی انتخابی فتح مخالفین اور مغرب کے لیے گہرا صدمہ ہے۔امریکی جریدے یو ایس اے ٹوڈے کی رپورٹ کے مطابق مغربی اور سیکولر تجزیہ نگاروں نے ترک الیکشن میں جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کی شکست کی پیش گوئی کی تھی جو یکسر غلط ثابت ہوئی۔اے ایف پی کے تجزیہ نگاروں نے رجب طیب اردگان کو ایک ایسی کرشماتی شخصیت کا مالک قرار دیا ہے جو ان کے حامیوں کی نگاہ میں ترکی کو مزید جدید اور روشن خیال بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔

ترک صحافی روشن قماش کا کہنا ہے کہ جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کی فتح پر ترک وزیراعظم احمد داؤد دغلو نے کہا آج عاجزی وانکساری اور شکر کا دن ہے،ہم محبتوں کے بیج بوتے ہوئے ترقی کی شاہراہ پر سب

کوساتھ لے کر چلیں گے۔ جرمن نیوز ایجنسی ڈی پی اے نے لکھا ہے کہ اس کامیابی میں نوجوانوں کا اہم کردار ہے جنہوں نے انتخابی مہم کے دوران گھروں سے باہر نکل کر غیر معمولی جوش وخروش کا مظاہرہ کیا، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ الیکشن میں ووٹنگ کی شرح 88 فیصد تھی ۔ترک تجزیہ نگار افہام سلجوق کا کہنا ہے کہ رواں سال جون میں ہونے والے الیکشن میں اگرچہ اردگان کی پارٹی روایتی اکثریت حاصل نہیں کر پائی تھی اور اسے حکومت سازی کے لئے کرداور حزب مخالف کی جماعتوں سے رابطہ کرنا پڑا لیکن مغربی میڈیا کے مطابق حزب مخالف کی جماعتوں نے ان سے اتحاد یا حکومت سازی کے لیے گفتگو تک سے انکار کر دیا جس پر رجب طیب اردگان نے اپنی پارٹی کے رہنماؤں کو عوامی رابطہ مہم شروع کرنے کا ٹاسک دیا اور محض چار ماہ کے بعد ''رن آف الیکشن'' کے دوسرے حتمی مرحلے میں جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی نے حصہ لیا جس کے بارے میں امریکی ،جرمن ،برطانوی ،فرانسیسی اور دیگر مغربی میڈیا نے دعویٰ دائر کیا تھا کہ رجب طیب اردگان کی جماعت الیکشن کے دوسرے مرحلے میں بری طرح شکست کھا جائے گی ۔لیکن الیکشن کے نتائج سے علم ہو گیا کہ مغربی میڈیا اور تجزیہ نگاروں کا دعویٰ مہمل تھا اور جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی نے یک طرفہ مقابلے میں مخالفین کو شکست دے کر پارلیمنٹ کی 550 نشستوں میں سے 316 نشستیں حاصل کر لی ہیں اور تنہا حکومت سازی کا حق حاصل کر لیا ہے۔

☆.....☆.....☆

غزل

سفر دیارِ طلب کا بڑا مہیب سا ہے
کہ جو بھی رستہ ادھر جائے ہے عجیب سا ہے

بتا کہاں ترے پیکر کی کرچیاں رکھوں
ہے جو بھی طاق تیری یاد کا صلیب سا ہے

ملانے دُور سے آئے ہو دُور کا رشتہ
حضور رشتۂ انسانیت قریب سا ہے

ترے سراپے کو ڈس لیں نہ شہر کی آنکھیں
کہ نیم باز دریچہ تلک رقیب سا ہے

وہ کیسے لاڈلی کا ہاتھ، اس کے ہاتھ میں دے
گو آدمی وہ بھلا ہے، مگر غریب سا ہے

عجب طرح کی ترقی ہے اس زمانے کی
کہ خوش نصیب بھی لگتا ہے بدنصیب سا ہے

ازل سے یاسمیںؔ وابستہ پھول خار سے ہے
یہ پھول کانٹے کا رشتہ بھی کیا حبیب سا ہے

نہ اس میں بوئے وفا ہے نہ اس میں رنگِ خلوص
تمہارا طرز تخاطب کسی خطیب سا ہے

سلام

آتے نہ کربلا میں جو سردارِ کربلا
کُھلتا کہاں یہ عقدۂ دشوارِ کربلا

تفسیرِ مصحفِ رخِ شبیر کی قسم
آئینہ خود ہے حاشیہ بردارِ کربلا

کیسے مٹائیں اس کو زمانے کی ظلمتیں
آیاتِ کرِدگار ہیں آثارِ کربلا

دنیا میں بے مثال کہانی حسینؓ کی
دنیا میں لازوال ہے کردارِ کربلا

پیشِ نظر ہے منظرِ کرب و بلا ہنوز
آنکھیں ہیں گویا روزنِ دیوارِ کربلا

جن سے بندھی ہوئی تھیں امیدیں رسولؐ کی
وہ مرکزِ یقین ہیں سرکارِ کربلا

لاکھوں سلام اے مرے مولائے تشنہ کام
لاکھوں درود قافلہ سالارِ کربلا

غزل

قفس کا ذکر بہت ہے ترے فسانے میں
تو آ کے جھانک ذرا میرے آشیانے میں

کہاں کہاں لیے گھومی ہے فکرِ آوارہ
نہ چین پایا ابھی تک کسی ٹھکانے میں

بھرم سروں کا تشخص کی آن بان سے ہے
زمانے لگتے ہیں سر کو علم بنانے میں

کرشمہ آپ کے تیرِ نظر کا دیکھتے ہیں
وگرنہ اتنے کہاں صید اک نشانے میں

پیاسے نکلے جو دو گھونٹ مانگنے گھر سے
بنے سراب کئی دریا آزمانے میں

تم اتنی دیر میں اپنے دیے جلا لیتے
گنوایا وقت جو میرے دیے بجھانے میں

جدھر بھی جایئے اک جیسا کرب منظر ہے
مزا نہیں رہا اب کوئی آنے جانے میں

نجمہ یاسمین یوسف

غزل

نغمگی گھول دیجئے صاحب
درد کو بول دیجئے صاحب

کوئی تعبیر بن کے آیا ہے
آنکھ اب کھول دیجئے صاحب

یہ کہانی کہانی کہلائے
اس میں کچھ جھول دیجئے صاحب

ہم محبت کی بھیک ڈالیں گے
دل کا کشکول دیجئے صاحب

دستکیں دے رہا ہے دل، دل کا
اب تو درِ کھول دیجئے صاحب

دل محبت میں دل محبت میں
مول کے مول دیجئے صاحب

پیار سے باندھ دیجئے یا مرے
بال و پر کھول دیجئے صاحب

اشکِ غم، قدر داں نہیں ہیں تو پھر
خاک میں رول دیجئے صاحب

نہ سخن فہمیِ جہاں پہ حبیبؔ
جذبِ دل ڈول دیجئے صاحب

حبیب الرحمٰن

شاعرہ

وہ قلم کے آسرے پر زندگی کرتی رہی
درد و غم سہتی رہی اور شاعری کرتی رہی

جذبِ قلب و شدّتِ احساس کی ماری ہوئی
نارسا ہے،غربت وافلاس کی ماری ہوئی

بے کس و لاچارہے،مجبور ہے تو کیا ہوا!
وہ قلم کی پاسباں معذور ہے تو کیا ہوا!

اس کو اقلیمِ سخن کی تاجور ایسا کیا
اس کو فطرت نے ودیعت اِک ہنر ایسا کیا

اُس کی خاطر گنبدِ افلاک روشن ہوگئے
کیا فلک!آفاق کے آفاق روشن ہوگئے

وہ سحرکی تازگی بھی ،اور اَندھیری رات بھی
اُس کے لہجے میں کھنکتا ہے شعورِ ذات بھی

وہ شکستہ پا ہے لیکن عزم اس کا سر بلند
اہلِ دل کی آبرو ہے غم زدوں کی درد مند

اپنے ٹوٹے دل کی جیسے ترجمانی بن گئی
وہ ! کہانی لکھتے لکھتے خود کہانی بن گئی

وحشتوں کی بھیڑمیں وہ کھو نہ جائے دو ستو!
دیکھنا پامال ہی وہ ہو نہ جائے دوستو!

رفعت خان

غزل

سمتِ بادِ مخالف چل
وقت کے سانچے میں مت ڈھل

ہے میری عظمت کا نشاں
میرے کاندھے پر یہ ہل

کچھ آنسو کچھ داغِ دل
اس دنیا میں سچ کا بدل

سوچ رہا ہوں تیرے بن
کیسا ہوگا اک اک پل

ہے دل تیرا کام یہی
دھیمی دھیمی آنچ میں جل

پتھر بن کے ڈھونڈ لیا
غم سے چھٹکارے کا حل

لے پر سازِ دل کی حبیبؔ
آؤ چھیڑیں کوئی غزل

حبیب الرحمٰن

ڈاکٹر عزیزہ انجم [1]

حجاب

آسماں کی رفعتیں چھوتا ہوا
تحفۂ یزداں، فرشتوں کی دعا
دامنِ مریم ، ردائے فاطمہؓ
اسوۂ امّاں خدیجہؓ ، عائشہؓ

گرمیوں کی دھوپ میں سایہ بنا
سرد موسم میں حرارت
ہر سفر میں ہم سفر میرا رہا
یہ مرا آنچل مرے سر پہ رکھا

یہ حریر و اطلس و کمخواب ہے
شان میں اپنی دُرِ نایاب ہے
یہ جمالِ سورۂ احزاب ہے
یہ حجاب و چادر و جلباب ہے

بنتِ حوا کی حیا کا پاسباں
یہ ہے انساں کے تمدن کا نشاں
نفس کی پاکیزگی کا ترجماں
یہ مقدس پیرہن، جنت نشاں

پالنے والے کا یہ فرمان ہے
بے حیائی فتنۂ شیطان ہے
جان لے جو صاحبِ ایمان ہے
بے حجابی دین کا نقصان ہے

روح میں اترا ہوا ایمان ہے
یہ حیا کے باب کا عنوان ہے
مومنہ عورت کی یہ پہچان ہے
گھر سے نکلے تو الگ ہی شان ہے

عظمتِ نسوانیت کا تاج ہے
اس میں رکھی آدمی کی لاج ہے
مشرق و مغرب میں اس کا راج ہے
اس کا چرچا، اس کی رونق آج ہے

[1] صدر پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن

D/Arshad hussain/batool2015-december2015

ڈائن

اُس کی اور میری عمروں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوگا.....لیکن اس کا کہنا ہے کہ وہ مجھے ''امی'' پکارے گی۔عزت احترام اور محبت کے ساتھ اس نے مجھے اپنی ماں کا درجہ دے دیا ہے۔

یوں تو اس بات میں کوئی برائی نہیں ہے.....لیکن میرے لیے یہ ایک بڑی آزمائش ہے۔وہ میرے گھر کام کرنے آتی ہے اپنا کام کرنے کے لئے وہ صبح وقت پر پہنچ جاتی ہے۔بعض دفعہ اس کی آمد کی گھنٹی مجھے وقت بتا دیتی ہے جو بالکل درست ہوتا ہے۔باورچی خانے میں برتن دھوتے ہوئے اس کو میز پر رکھے ناشتے کے برتنوں کا خیال آتا ہے۔ وہ انہیں سمیٹ کر لے جاتی ہے۔کام کے دوران میری دی ہوئی ہدایتوں کو وہ پوری طرح یاد رکھتی ہے۔کام کے اختتام پر وہ کچرا تھیلی میں ڈالتی ہے۔چولہے، شیلف فرش کو صاف کرتی ہے.....اور خدا حافظ کہہ کر چلی جاتی ہے۔

میری دی گئی روٹی اور کل کے باسی سالن کو ممنونیت کے ساتھ قبول کر لیتی ہے.....لیکن ساتھ درخواست کرتی ہے کہ میں اسے فرج میں رکھ دوں شام کو گھر واپسی پر وہ انہیں لے لے گی.....اس کے جانے کے بعد میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے.....کیا کوئی ماں اپنے بچوں کو باسی کھانا کھلائے گی اور خود تازہ کھائے گی؟.....اس نے ماں بنایا ہے اب اُس کی سردی گرمی، بھوک پیاس کی فکر مجھے کرنا چاہیے.....کم از کم اتنی جتنی کہ آسانی سے ہو سکے..... باسی کھانے کے ساتھ میں اُسے کچھ تازہ کھانا بھی دے سکتی ہوں.....اُس کے میلے اور ناکافی لباس کو دیکھ کر کیا لازم نہیں کہ اپنی الماری کا کچھ بوجھ ہلکا کروں.....اس کی تکلیف دہ چپل جس سے اُس کی ایڑی باہر رہتی ہے..... مجھے پریشان کرتی ہے چلیے ٹھیک کہا آپ نے.....چپل کا ایک جوڑا دینا کیا مشکل ہے؟؟

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر ہفتہ آٹا اور راشن کا تقاضہ کرتی ہے.....

یوں میرے لئے ایک بڑی آزمائش بن جاتی ہے..... بہر حال ماں ہونے کا بھرم بھی رکھنا ہوتا ہے۔

آجکل وہ میرے سر کی مالش کے لئے بضد ہے.....کہتی ہے مجھے ماں کی خدمت کرنا ہے.....ٹھیک ہے کل کراؤں گی.....اس کو باتیں کرنے کا شوق ہے۔اپنے بارے میں اپنے گھر اور گاؤں کے بارے میں وہ اکثر بتاتی ہے۔خاص طور سے گاؤں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک چمک جاتی ہیں۔میں اس کی اپنے گاؤں سے محبت جان گئی ہوں۔ایک دفعہ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اپنا گاؤں کیوں چھوڑ آئی۔اُس کی آنکھیں نم ہوگئیں کہنے لگی

''مجبوری ہے گاؤں میں کوئی روزگار نہیں ہاں کھیتوں میں پھٹی چننے یا زمین سے سبزی کاٹنے کا کام ہے۔یا کھدائی کر کے سبزی مولی گاجر وغیرہ نکالنی ہوتی ہے۔یہ زیادہ محنت والا کام ہے صبح سے شام تک کام کرنا ہوتا ہے۔پھر بھی پیسہ بہت کم ملتا ہے کیا کریں ماں جی! زندگی گزارنے کو کچھ پیسہ تو چاہیے ہوتا ہے۔

واقعی کتنا سچ کہا اُس نے.....زندگی گزارنے کو کچھ پیسہ تو چاہیے ہوتا ہے۔

مجھے اپنے میاں کی بات یاد آگئی۔حکومت کے ایک ادارے میں کام کرتے تھے۔جب میں شادی ہو کر آئی تو گھر چھوٹا سا تھا دو کمروں کا.....ایک کمرہ ڈرائینگ روم تھا اور دوسرا ہمارا بیڈروم جب میرا جہیز کا ڈبل بیڈ وہاں لگا تو کمرہ گویا بھر سا گیا۔بڑی مشکل سے الماری اور سنگھار میز کی گنجائش نکل سکی۔بعد میں میں نے انہیں جتایا زندگی گزارنے کو کچھ پیسہ درکار ہوتا ہے۔پھر آپ کے محکمے میں تو لوگ کہتے ہیں چاندی ہی چاندی ہے۔

کیوں تم کو کچھ کمی ہے کیا؟ وہ پوچھنے لگے

کمی سی کمی!!

میں نے چاروں طرف ایک نظر ڈال کر بیزاری سے کہا۔بس پھر

وہ ہی بات زندگی گزارنے کو کچھ پیسہ تو درکار ہوتا ہی ہے۔ یہ بات میرے میاں نے کچھ ہی دن میں سمجھ لی.....میرے سمجھانے سے.....

وہ جس حکومتی محکمے میں ملازمت کرتے ہیں ، وہاں غیر آباد اور پسماندہ علاقوں کی آبادکاری اور ترقی کے لئے بہت سے فنڈ ملتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ ہماری حکومت غریبوں کے لئے اتنے فنڈ مہیا کرتی ہے۔مگر حکومت کو یہ احساس نہیں کہ جن افسروں نے اتنی محنت کرنی ہے انہیں بھی صلہ ملنا چاہیے، پھر ایسے حالات میں اپنی فکر تو خود ہی کرنی پڑتی ہے نا! اپنی اولاد کا مستقبل تو ہمارے ہی ہاتھوں میں ہے اور پھر حکومت کے پاس کون سا پیسے کی کمی ہے!

بس پھر کچھ نہ پوچھیں آمدنی میں کیسے پر لگے اور کیسے ہم نے پرانا محلّہ چھوڑ کر یہ تین بیڈ رومز کا خوبصورت سا بنگلہ خریدا۔اس کی آرائش و زیبائش میں میرے میاں صاحب نے خوب ذوق دکھایا..... یہ الگ بات کہ ایک ایک چیز میرے مشوروں سے خریدی گئی۔

بس ابھی سال ہی ہوا ہے اس میں رہتے ہوئے۔میرا دل اس کی صفائی اور سجاوٹ میں خوب لگتا ہے۔اسی لئے میں نے ماسی کو ابھی صرف برتن پر رکھا ہوا ہے۔

بس یہ سمجھیں کہ یہ مشورہ میری امی جان نے دیا تھا کہ بیٹا اپنے جسم کا خیال رکھنا موٹی ہوگئیں تو اولاد کے لئے مشکل ہوتی ہے.....بس کیا بتاؤں آپ کو.....ابھی ہم دو کے دو ہی ہیں تین نہیں ہوئے نا!!

میں نے سوچا ہوا ہے کہ جیسے ہی رزلٹ پوزیٹو آئے گا سارے کام ماسی کے سپرد کردوں گی.....

لیجئے بیل بجی ہے۔وہ آ گئی۔دو دن سے کیا سر کی مالش کرتی ہے۔ زبردست.....آج بھی کراؤں گی۔ مالش کے الگ سے کچھ پیسے دے دوں گی۔غریب عورت ہے محنت کرتی ہے تو اس کی محنت کا پیسہ تو دینا ہی چاہیے.....آج سارے کام کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ وہ مالش کے لئے خاص تیل لائی ہے۔جس سے بال بہت خوبصورت ہو جاتے ہیں خشکی کا تو نام نہیں رہتا۔

اُف!! میرا سر.....میرے سر میں کیا ہوا ہے؟

میں تو مالش کروا رہی تھی.....

بڑی مشکل سے میری آنکھیں کھلیں۔ میں نے دیکھا دو آدمی الماری کھولے کھڑے تھے۔ یہ کون ہیں میں نے اٹھنا چاہا۔لیکن اٹھ نہ سکی۔میرے ہاتھ پاؤں کرسی سے بندھے تھے۔رسیوں سے جکڑی میں کرسی پر بندھی ہوئی تھی۔

چیخنا چاہا.....لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔سانس تک گھٹ گئی۔ خوف کے مارے میری آنکھیں پھٹ گئیں۔دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

یا اس عورت کی چوڑیاں اتر نہیں رہی تھیں میں نے پلاس سے کاٹ کر اتار لیں لیکن دو انگلیوں میں انگوٹھیاں بہت پھنسی ہوئی ہیں۔کسی طرح نہیں اتر رہیں۔ایک بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی نے زور سے کہا۔

انگوٹھیاں ہیرے کی ہیں۔قیمتی پتھر لگے ہیں۔ہرگز نہیں چھوڑنا..... چاہے انگلیاں کاٹنی پڑیں۔

یہ میری ماسی کی آواز تھی جو میری پشت پر سنگھار میز کی درازیں کھنگال رہی تھی۔

بڑی ظالم ہے تو.....تو نے تو اسے ماں بنایا ہوا تھا۔ایک دوسرا لمبا اور دبلا آدمی بولا۔

کسی کو میرے ہوش میں آنے کی پروا نہیں تھی.....وہ ایک ایک چیز کو چھان رہے تھے۔

ہونہہ.....کیسی ماں.....دوسروں کا حق کھانے والی ڈائن!!!

جو اولاد ابھی دنیا میں نہیں آئی ..... اس کے لئے میری جیسی غریب بے بس ماؤں کے بچوں کا حق ڈکارنیوالی.....یہ ہمارا حق مار کر اپنے گھر بھرنے والے لوگ.....ان پر ترس کیا!

اس نے نفرت سے مجھے دیکھا.....کیسی نفرت غصے اور انتقام کی آگ تھی اس کی آنکھوں میں.....میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

مجھے یاد آیا.....ایک دفعہ اس نے مجھے رو رو کر اپنے دو بچوں کے بارے میں بتایا تھا جو فاقے اور بیماری کے ہاتھوں چل بسے تھے.....اور جن کے مرنے کے بعد اس نے اپنا گاؤں چھوڑ دیا تھا۔☆

☆.....☆.....☆

ہاتھ سے جنت نہ گئی

حمیرا کی اس سے پہلی ملاقات ایک عید ملن پارٹی کے موقع پر ہوئی تھی۔ دیارِ غیر میں رہتے ہوئے انسان اپنوں سے ملنے جلنے کے لئے ایسے بہانوں سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔حمیرا اس کی طرف بڑھی،علیک سلیک ہوئی تو اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''میرا پرانا نام پروندر سنگھ تھا،لیکن اب میرا نام صفیہ خان ہے''

حمیرا نے لمحہ بھر کیلئے اسکے سراپے کو دیکھا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس حجاب لئے ہوئے تھی۔حمیرا مارے تجسس کے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''کیا تم مجھے بتانا پسند کروگی کہ تمہارے اندر یہ تبدیلی کیسے آئی ؟''

''ہاں!ہاں! کیوں نہیں، ہر دفعہ جب میں یہ قصہ بیان کرتی ہوں تو میرے اندر ایک نئی توانائی دوڑ آتی ہے اور میرا دل شکر کے احساس کے ساتھ جھک جاتا ہے۔

یہ کہہ کر وہ گویا ہوئی:

میرا تعلق بھارت کے شہر دلی سے ہے۔میرے میاں امجد خان آگرہ کے رہنے والے ہیں۔آج سے چند سال پیشتر ہم دونوں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے امریکہ آ گئے تھے۔ یہاں یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران ایک دوسرے سے شنا سائی ہوئی۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ پڑھائی کے فوراً بعد شادی کر لیں گے۔ پڑھائی سے فارغ ہوئے تو نوکری کی تلاش شروع کر دی۔خوش قسمتی سے جلد ہی دونوں کو ملازمت مل گئی۔اس کے بعد ہم نے اپنے اپنے والدین کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ دونوں طرف سے سخت ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے ہمارے والدین نے پیار سے سمجھایا بجھایا، پھر آگ بگولا ہوئے، پھر دھمکیوں پر اتر آئے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر ہم اپنے ارادے سے باز نہ آئے تو وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے تعلق توڑ لیں گے۔لیکن اس وقت عشق کا بھوت سر پر سوار تھا اور ہمیں یہ بھی یقین تھا کہ ان کی دھمکیاں صرف گیدڑ بھبکیاں ہی ہیں۔بھلا والدین کتنی دیر تک اولاد سے لاتعلق رہ سکتے ہیں۔

اب ہماری شادی کی راہ میں صرف ایک ہی رکاوٹ تھی۔امجد کی ضد تھی کہ میں اسلام قبول کر لوں جبکہ میرے لئے وقتی طور پر والدین کو چھوڑنا قدرے آسان تھا لیکن ہمیشہ کے لئے اپنا دھرم چھوڑنا مشکل تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں۔وقت آنے پر میں بآسانی امجد کو قائل کر لوں گی۔چنانچہ میں نے امجد کو سمجھانا شروع کیا کہ

''دیکھو! شادی ایک الگ چیز ہے اور دھرم کا معاملہ الگ ہے۔ دونوں کو اکٹھا مت کرو۔میرے پتا جی سکھ ہیں جبکہ ماتا جی ہندو ہیں اور مذہب کے اختلاف کے باوجود وہ دونوں بہت خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔اگر ہم بھی شادی اور دھرم کو فلط ملط نہیں کریں گے تو ہمیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔''

لیکن امجد کسی طور مان کر نہیں دے رہا تھا۔آئے دن ہم دونوں اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہر دفعہ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔آخر ایک دن تنگ آ کر میں نے امجد سے کہا

''اس شادی کے فیصلے کی وجہ سے میرے والدین مجھ سے خفا ہو گئے ہیں اور تم بھی مجھ سے راضی نہیں آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

''میری صرف ایک ہی شرط ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن میں مجبور ہوں۔اس کے بغیر میں شادی نہیں کر سکتا۔''

میں نے پوچھا۔

''اسلام لانے کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

امجد نے کہا

''صرف چند الفاظ پر مشتمل ایک کلمہ پڑھنا ہوگا اور بس.....''

میں نے پوچھا کہ

''کیا اس کے علاوہ بھی تمہارا کوئی اور مطالبہ ہوگا؟ یا تم مجھ پر کچھ پابندیاں بھی عائد کرنا چاہو گے؟ میں کلمہ پڑھنے کے لئے تیار ہوں لیکن اس کے بعد اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہوں گی۔''

امجد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اس کے علاوہ میرا کوئی اور مطالبہ نہیں۔''

چنانچہ میں نے امجد کے ساتھ کلمہ پڑھا اور ہم دونوں قریبی مسجد میں چلے گئے۔ امام صاحب نے ہم دونوں کا نکاح پڑھایا اور پھر کہنے لگے۔

بہن! اگر آپ پسند کریں تو اب ہم آپ کو نئے اسلامی نام سے پکارا کریں۔ یہ سن کر میں بھڑک اٹھی۔ میں نے کہا

''پہلے میں نے اپنے والدین کو چھوڑا، پھر دھرم کو چھوڑا۔ اب نام کو بھی چھوڑ دوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ میرا نام میری شناخت ہے یہ مجھ سے جدا نہیں ہوسکتا۔''

امام صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''بہن! جیسی آپ کی مرضی۔ واقعی پرانا نام شخصیت کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور اسی کو اپنائے رکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔''

امجد نے ان کی تائید کی اور ہم خوشی خوشی مسجد سے گھر لوٹ آئے اور نئی زندگی کی ابتدا کردی۔

شادی کے کچھ عرصہ کے بعد ہم دونوں نے بار بار فون کر کے اپنے اپنے والدین کو منانے کی کوشش کی لیکن خلاف توقع ان کا غصہ اور ناراضگی برقرار رہی۔ دراصل امجد کے والدین دکھی تھے کہ ان کے بیٹے نے ایک سکھنی سے شادی کرلی اور میرے والدین کو یہ دکھ تھا کہ ان کا داماد مسلمان تھا۔ بچے آخر بچے ہوتے ہیں اور پھر ہم تو ضدی والدین کے ضدی بچے تھے۔ ہم نے سوچا کہ جب ہماری منت سماجت ان پر اثر انداز نہیں ہو رہی تو نہ سہی۔ ہم ان سے سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟ بہت ہولیا۔ ہم نے اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی۔ ہمارا فرض ادا ہوا اب جب ان کو ہماری یاد آئے گی تو خود ہی رجوع کرلیں گے۔

اسی دوران ہمارے گھر کے آنگن میں دو پھول کھل اٹھے۔ زندگی پہلے سے بڑھ کر مصروف ہوگئی۔ میں اپنے گھر بار میں خوش اور مگن تھی لیکن جب کبھی والدین کا خیال آتا تو دل میں کسک سی ہوتی تھی۔ پھر میں اپنے آپ کو یہ سوچ کر تسلی دے لیتی کہ وہ لوگ بھی تو ہیں جن کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ اگر وہ بھی ان کی جدائی کے باوجود زندہ ہیں تو پھر بھلا مجھ پر یہ جدائی بھاری کیوں ہے۔

ایک دن اچانک بیٹھے بٹھائے مجھے یہ خیال آیا کہ میں نے جو کلمہ پڑھا تھا، میں تو اسے بھول چکی ہوں بھلا نیٹ کھول کر دیکھوں تو سہی کہ یہ اسلام ہے کیا شے۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میں نے نیٹ کھول لیا اور پڑھتی چلی گئی۔ جب یہ پتہ چلا کہ اسلام کو جاننے کے لئے قرآن کے پیغام کو پڑھنا ضروری ہے تو میں نے نیٹ کے ذریعہ ہی قرآن کا انگریزی میں ترجمہ پڑھنا شروع کردیا جوں جوں میں پڑھتی چلی گئی میرے اندر تبدیلی ہوتی چلی گئی۔ وہ کلمہ جسے میں نے اپنی خواہش کے تحت نہیں بلکہ صرف مجبوری سمجھ کر بلا سوچے سمجھے پڑھا تھا، وہی میری ہدایت کے راستے کا سنگ میل بن گیا، وہی نشان راہ بنا اور وہی حاصل زندگی بن گیا۔

جب میں نے قرآن میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں پڑھا تو میرے دل کی خلش بڑھ گئی اور میں بار بار امجد کو سمجھانے لگی کہ ہمارے والدین ہماری جنت ہیں اور جب تک ہمارے والدین ہم سے راضی نہ ہوں گے، ہمیں چین سے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم از سر نو انہیں منانے کی کوشش شروع کردیں تا کہ وہ راضی ہو جائیں۔

چنانچہ ہم دونوں نے بار بار اپنے والدین کو فون کئے لیکن ادھر سے برف نہیں پگھلی اور ہر دفعہ چند غصیلے اور دکھی جملوں کے بعد

انہوں نے فون بند کر دیا۔ جب یہ کوشش بار آور نہ ہوئی تو ہم نے سوچا کہ ہم دونوں بھارت جا کر اپنے اپنے والدین کی خدمت میں خود حاضر ہو کر انہیں منانے کی سعی کرتے ہیں۔

ہم نے اپنے دونوں بچوں کو امریکہ میں موجود امجد کی خالہ زاد کے ہاں چھوڑا اور دو ہفتے کے لئے بھارت چلے گئے۔ بچوں کو اس لئے ساتھ لے کر نہیں گئے کہ وہ وہاں ہماری اور ہمارے والدین کے درمیان ہونے والی متوقع ناخوشگوار گفتگو سن کر متاثر نہ ہوں۔ بھارت پہنچ کر میں نے دلی کی راہ لی اور امجد آگرہ جا پہنچے۔

جب میں اپنے والدین کے گھر تک پہنچی تو میرا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دیوار پر نصب شدہ گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اندر سے ماتا جی کی شناسا آواز آئی

''کون ہے؟''

میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا

''دروازہ کھولیں۔''

انہوں نے بے یقینی کے عالم میں دروازہ کھولا۔ جونہی ان کی نظر مجھ پر پڑی، وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ ان کی آواز سن کر پتا جی بھی باہر نکل آئے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ وہ لمحہ بھر کے لئے رکے، پھر تیزی سے پلٹے اور بنا کچھ کہے واپس لوٹ گئے۔ والدین کو دیکھ کر میرا دل بوجھل ہو گیا۔ اتنے عرصے میں دونوں کتنے بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ میرے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ میں نے گھر میں داخل ہونے کے لئے قدم بڑھائے لیکن ماتا جی ہذیانی انداز میں چیخنے لگیں۔

''خبردار.....ملیچھ.....اپنے ناپاک قدم میرے گھر میں مت رکھنا۔ تم جہاں سے آئی ہو، وہیں لوٹ جاؤ۔ اس گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم تمہارے لئے مر گئے اور تم ہمارے لئے مر چکی ہو۔ ہم نے اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ لی ہے۔ اب ہمیں اپنی صورت دکھا کر سزا نہ دو۔''

ماتا جی کی آوازیں سن کر پتا جی دوبارہ باہر نکل آئے اور انہوں نے ماتا جی کے قریب جا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ پا سکیں اور پتا جی کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگیں۔ یعنی میری شیرنی کی طرح گرجنے برسنے والی ماتا جی، پتا جی کے آسرے اور میری محبت کے سامنے ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئیں۔ پتا جی نے مجھے کہا۔

''جو کہنا چاہتی ہو، اندر آ کر بات کرو۔''

میں نے کہا

''پہلے ماتا جی سے ان کے گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت لے کر دیں۔ ورنہ میں بھوکی پیاسی دہلیز پر بیٹھی رہوں گی، چاہے کتنا زمانہ بیت جائے۔''

پتا جی نے دھیمے لہجے میں کہا

''میرا خیال تھا کہ اتنا پڑھ لکھ کر تمہارا مزاج بدل گیا ہو گا لیکن تم تو ابھی تک ویسی ہی ضدی ہو، جیسی پہلے تھی۔''

پھر وہ لمحہ بھر کیلئے رکے اور کہنے لگے

''ہم دونوں کی طرف سے اجازت ہے۔ اب کیا ہم لکھ کر دیں گے تو تم اندر آؤ گی۔ یہ گھر پہلے بھی تمہارا تھا اور آج بھی اس پر تمہارا حق ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں نے بہت کوشش کی کہ تمہیں بھول جائیں لیکن ہم اپنے دل کے ہاتھوں ہار گئے۔''

یہ کہہ کر پتا جی نے اپنے بازو پھیلائے اور میں ان کے سینے سے جا لگی۔ اب رونے کی میری باری تھی پتا جی کا بوڑھا اور کمزور وجود آج بھی میرے لئے کسی گھنے شجر سایہ دار کی طرح تھا۔ ان کے نحیف و نزار بازو کسی فصیل کی طرح میرے اردگرد پھیلے ہوئے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بچپن کی طرح ان کے پاس آ کر میں ہر خوف سے دور ہو گئی ہوں۔

ماتا جی کے چہرے سے بھی تناؤ کے آثار ختم ہو گئے۔ انہوں نے بھی مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور گلوگیر آواز میں کہنے لگیں۔

''تمہارے پتا جی سچ کہتے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد ہماری زندگیوں میں کبھی کوئی دن ایسا نہیں آیا کہ ہم نے تمہیں یاد نہ کیا ہو، تمہارے بارے میں سوچا نہ ہو، تمہارے بچپن کے قصے نہ دہرائے ہوں اور تمہارے تصور سے دل نہ بہلایا ہو۔''

چند لمحوں کے بعد اچانک انہیں یاد آیا اور وہ پوچھنے لگے

''اری تو نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟''

میں نے کہا

''پہلے تو احساس ہی نہیں تھا لیکن اب اچانک بھوک چمک اٹھی ہے''

وہ محبت سے پوچھنے لگیں۔

''اچھا بتا کیا کھائے گی؟''

میں نے شوخی سے جواب دیا

''ماتا جی! میں آپ کی گود میں پروان چڑھی۔ اتنے برس آپ نے مجھے کھلایا پلایا۔ مجھ سے بڑھ کر آپ جانتی ہیں کہ میں کیا شوق سے کھاتی تھی۔ میری پسند ابھی بھی نہیں بدلی۔ وہی کھاؤں گی جو آپ کے ہاتھ سے کھایا کرتی تھی یعنی پراٹھا اور اچار۔''

وہ بھاگم بھاگ رسوئی میں پہنچیں اور میرے لئے پراٹھا بنانے لگیں۔ میں بھی ان کے قریب بیٹھ گئی پتا جی فریج کھول کر میرے سامنے مختلف چیزیں رکھنے لگے۔

''دیکھ! یہ آلو بخارے کی چٹنی بھی ہے، دھنیے اور پودینے کی چٹنی بھی، سرسوں کا ساگ بھی ہے اور سبزی کی بھاجی بھی، بیسن کی مٹھائی بھی موجود ہے۔ اگر بازار کی کوئی چیز کھانا چاہتی ہو، تو وہ بھی پل بھر میں لے آؤں گا۔''

''اتنے سال بازار کی چیزیں کھا کھا کر گزارے۔ میں تو ماتا جی کے ہاتھوں کے بنے ہوئے کھانے کو ترسی ہوئی تھی۔ اس لئے صرف وہی کھاؤں گی جو وہ خود بنا کر دیں گی۔ اور ہاں! آپ کہیں نہیں جا رہے۔ یہیں رہیں گے میری نظروں کے سامنے۔ میں آپ دونوں کے چہرے ہی تو دیکھنے آئی ہوں۔ اس لئے آپ کو غیر حاضری کی ہرگز اجازت نہیں دوں گی۔''

میری بات سن کر پتا جی زیر لب مسکرا دیئے اور ماتا جی بے اختیار بول اٹھیں۔

''کوئی کہیں نہیں جا رہا..... تو جلدی سے کھانا کھا لے پھر ذرا آرام کر لینا۔ اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہے۔ تھک گئی ہوگی میری بٹیا رانی۔''

شکر ہے کہ ہم تینوں کے درمیان مطلع یوں صاف ہو گیا جیسے کبھی کوئی ناخوشگوار بات ہوئی ہی نہ تھی۔ جیسے تعلقات میں کبھی کوئی فاصلہ، کوئی دوری، کوئی وقفہ، کوئی رخنہ آیا ہی نہ تھا۔ جیسے ہمیشہ سے سب کچھ نارمل تھا..... حسب سابق، حسب معمول وہی مہربان و شفیق والدین تھے اور وہی فرمائشیں کرنے والی، اپنی منوانے والی، ضدی، چھوٹی سی نادان لڑکی۔

میں کھانا کھا کر ماتا جی کے ساتھ ہی بستر پر دراز ہو گئی۔ وہ ہولے ہولے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگیں

''آنکھیں بند کر کے تھوڑی دیر کے لئے سو جا۔ تھکن اتر جائے گی۔''

میں نے کہا

''نیند کا نام و نشان نہیں اور رہ گئی تھکن تو وہ آپ دونوں کو دیکھ کر اتر گئی تھی۔''

انہوں نے پوچھا

''اتنی دیر کے بعد تجھے کیسے ہمارا خیال آیا؟''

میں نے کہا

''آپ سے بچھڑ کر میں ہمیشہ بیقرار رہی لیکن پھر ایک مسئلہ آن پڑا اور مجھے اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر آنا پڑا۔''

میں نے پیار سے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

''ہاں سب خیریت ہے۔ بات صرف اتنی تھی کہ ایک دن میں اپنے نئے دھرم کی تعلیمات کے بارے میں پڑھ رہی تھی اور جب مجھے یہ علم ہوا کہ میں جس خدا پر ایمان لائی تھی، وہ اس وقت تک مجھے نہیں ملے گا، جب تک میں آپ دونوں کو اور امجد اپنے والدین کو راضی نہ کر لے۔ میں نے سوچا کیا فائدہ کہ والدین بھی ناراض رہیں اور خدا بھی راضی نہ ہو۔ چنانچہ ہم دونوں آپ کو اور اس کو منانے نکل آئے۔''

ماتا جی کہنے لگیں

''ہاں، سب دھرم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں۔ تم اگر اپنے دھرم

پر قائم رہتیں تو اچھا تھا لیکن چلو جیسے تمہاری مرضی، جیسے تمہاری خوشی۔ اب ناخن سے گوشت تو جدا نہیں ہوسکتا ناں۔ تمہیں ہم چھوڑ نہیں سکتے کہ تم ہماری کمزوری ہو۔ تم بے شک اپنا راستہ اپنائے رکھو البتہ ہم اپنی راہ پر چلتے رہیں گے۔''

پھر میں نے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے اپنے بچوں کی تصویریں نکالیں اور انہیں دکھائیں۔ وہ دونوں تصویروں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتے رہے اور ان کی بلائیں لیتے رہے۔ پھر گلہ کرنے لگے کہ ہم ان کو ساتھ کیوں نہیں لائے۔ کچھ دیر کے بعد ماتا جی کو خیال آیا۔ وہ کہنے لگیں کہ

''تم فون کر کے امجد کو بھی یہاں آنے کی دعوت دے دو۔ اچھا ہے کہ وہ بھی چند دن ہمارے پاس ٹھہر جائے۔''

چار پانچ دن کے بعد امجد بھی آ گئے۔ میرے والدین نے انہیں خوش آمدید کہا۔ امجد وہاں تین دن ٹھہرے۔ پھر ہم دونوں نے آگرے سے جانے کا پروگرام بنایا تا کہ چند دن امجد کے والدین کے ساتھ بھی گزار لیں۔ میرے لئے یہ امتحان کی گھڑی تھی۔ کیونکہ اپنے والدین کو منانا تو چنداں مشکل نہیں تھا لیکن امجد کے والدین کو راضی کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اب وہ اپنے بیٹے سے راضی ہو چکے تھے لیکن بہو کو معاف کرنا شاید ان کے لئے بھی مشکل تھا۔

بہر حال جب ہم امجد کے گھر داخل ہوئے تو اس کے والدین میرا حلیہ دیکھ کر ٹھٹک گئے اور میں نے ان کی آنکھوں میں مجھے قابل قبول تسلیم کرنے کا تاثر دیکھ لیا۔ میں آگے بڑھ کر امی کے گلے لگ گئی اور ان سے کہا

''میری وجہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی ہے، میں اس کے لئے آپ سے معافی کی خواستگار ہوں آئندہ انشاءاللہ آپ کو کبھی دکھ نہ دوں گی۔''

امی کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ان کی آواز بھرا گئی۔ انہوں نے مجھے کچھ کہنا چاہا لیکن بول نہ پائیں ابا جی نے آگے بڑھ کر میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

ہم دونوں چند دن وہیں ٹھہرے۔ امی کا بس نہیں چلتا تھا کہ ہم دونوں کو اپنے ہاتھ سے کیا کچھ نہ پکا کر کھلائیں۔ میں کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ امجد سائے کی طرح ابا جی کے ساتھ رہے۔ میں یہی سوچتی رہی کہ والدین کو منانا تو بے حد آسان تھا۔ ہم نے بھلا ان انمول گھڑیوں کے لئے اتنا لمبا عرصہ کیوں گنوایا۔ کیوں اتنی دیر کر دی۔

ہماری چھٹی ختم ہو گئی اور جب ہم بھارت سے واپس امریکہ لوٹے تو ہم دونوں بے حد ہلکے پھلکے اور پر سکون تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہمارے سروں سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ جیسے دلوں کو قرار آ گیا ہو اب ہمارے والدین گاہے گاہے کچھ عرصہ کیلئے ہمارے پاس آ کر ٹھہرتے ہیں اور ہم دونوں بھی ہر سال ان کو ملنے کے لئے جاتے ہیں۔ جب بھی میں اپنے والدین کو اپنے پروگرام کے بارے میں مطلع کرتی ہوں تو ماتا جی میرے پہنچنے سے پہلے میرے کمرے میں جائے نماز اور قرآن رکھنا کبھی نہیں بھولتیں۔

میرے والدین امجد سے بہت خوش ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا اچھا داماد تو ہمارے خاندان بھر میں نہیں۔ امجد کے والدین بھی مجھ سے بہت راضی ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم خوش قسمت ہیں کہ ایسی لڑکی ملی ہے جو بہو بن کر گھر میں آئی تھی اور بیٹی بن کر دل میں اتر گئی۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

مجھے تیری ضرورت ہے

بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کیلئے جانے والے نوجوانوں کیلئے ایک عبرت آموز تحریر

اس سال جب پاکستان جانا ہوا، تو مریضوں سے دوری کو قربت میں بدلنے کا موقع یوں ملا کہ ایک ہسپتال کی انتظامیہ نے درخواست کی کہ آپ ہمارے ہاں گائنا کالوجسٹ کی جگہ خالی ہے اور مریض بہت پریشان ہو رہے ہیں ہماری ڈاکٹر ایک ماہ بعد آ جائیگی۔ اتنے عرصے کیلئے آپ گائنی وارڈ کو سنبھال لیں۔

موقع اچھا تھا۔ دل بھی اداس تھا۔ پھر خدمت خلق کا ایک موقع عطا ہوا تھا اسے کیوں جانے دیتے۔ بس گرمی ..... اور رمضان لیکن اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی اور حامی بھر لی۔

رہنے کیلئے گھر اور کھانا میس سے آ جاتا تھا۔ ماضی کی کتنی یادوں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔

اللہ کا شکر ادا کر کے چارج سنبھال لیا۔ ایک ہفتے میں راستے، سیڑھیاں، سٹاف، لوگ، عملہ، کمرے، کچھ کچھ واقفیت ہو گئی۔ جیسے کوئی بچھڑا ہوا صدیوں بعد ملا ہو شاید دسواں دن تھا۔

آؤٹ ڈور میں رش تھا۔ کیونکہ صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک آپریشن تھیٹر میں مصروف رہے۔

اچانک ایک خاتون جس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہو گی۔ اس نے اپنی پرچی آگے رکھی۔

میں نے بغیر دیکھے کہا۔

جی کیا تکلیف ہے آپ کو

کہا آپ کے پاس غم کا کوئی علاج ہے۔

یہ خلاف توقع جواب سن کر میں نے نظریں اٹھائیں اور اسے غور سے دیکھ کر کہا جی ..... کیا کہا آپ نے .....

جدائی کے کرب سے کون سی دوا نجات دلا سکتی ہے.....

اس کے چہرے پر بلا کا کرب تھا۔ چہرے پر بے شمار سلوٹیں، کھچڑی بال، میلے کپڑے معمولی سی چپل ہاتھ میں ایک بیگ.....

میں نے اسکے ظاہر سے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ لیکن سامنے استقامت اور صبر کے پہاڑ کھڑے تھے اور اس کی شخصیت انکے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔

میں نے سوچا۔

کوئی حادثہ..... واقعہ..... گہری چوٹ..... دنیا کی بے رخی اپنوں کی بے اعتنائی غربت..... بس یہاں تک ہی سوچا تھا۔

وہ بولی۔

فراز نے کہا تھا

میرے چہرے پر سلوٹیں ہیں تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ آپ سے زیادہ پہنا

اب تو حیرت سے میری زبان بند..... وہ کس طرح میری سوچ پڑھ رہی تھی یقیناً پڑھی لکھی تھی اور میں ابھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔

اگر آپ تھوڑی دیر انتظار کر لیں تو مریض ختم کر کے میرے ساتھ گھر چلیں وہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرینگے۔

اب زندگی میں اطمینان کہاں..... مگر شائد یہ دولت آپ کو نصیب ہو تو آج مجھے بھی خیرات مل جائیگی۔

میں اپنے جملے پر شرمندہ ہو گئی۔

یا الٰہی ..... یہ کوئی ولی اللہ معلوم ہوتی ہے مجھے حضرت علیؓ کا قول یاد آیا کہ کسی کو حقیر نہ جانو کیا پتہ وہ ہی اللہ کا ولی ہو۔

مریض ختم کر کے ہم گھر چلے آئے۔ گھر ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں

واقع تھا۔ پانچ منٹ کی واک تھی۔

تالا کھولا، اے سی چلایا اور اجازت چاہی کہ نماز ادا کرلوں وہ بولی میں بھی پڑھونگی۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ پرچی پہ بھلا کیا نام لکھا تھا۔ محمودہ بیگم..... یاد آ گیا عزت رہ گئی۔

میں نے کہا باتھ روم ادھر ہے پہلے آپ وضو کرلیں آپ میری مہمان ہیں اس لئے آپ کا حق فائق ہے۔

وہ بولی۔

آپ کی اردو بہت اچھی ہے کیا آپ لکھتی ہیں۔

مجھے اپنا آپ اس کے سامنے بہت کم مایہ لگ رہا تھا۔ جی بس کچھ نہ کچھ..... یہ ادھر رسالے پڑے ہیں لگتا ہے آپ کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔

جی..... وہ باتھ روم میں چلی گئی۔

نماز سے فارغ ہوئے۔

میں نے پوچھا۔ محمودہ آپ مجھے شروع سے اپنی کہانی سنائیں شاید میں کسی زخم پر کوئی مرہم رکھ سکوں۔

اس نے کہا

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
باہر اندر ہے ایک سناٹا
ہم کہیں اور سنا کرے کوئی

واہ واہ لاجواب

اسے کیا معلوم۔ میری امی جان کا نام مریم ہے میڈیکل کالج میں یہ شعر اکثر میرے لئے پڑھا جاتا آپ کی اب تک کی گفتگو سے تو آپ کا ذوق نفیس بتا رہا ہے کہ آپ بہت بہادر ہیں۔ چھوٹے موٹے غم تو آپ کا دکھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ تھکاوٹ اور پیاس غائب ہو چکی تھی۔

میں نے کہا میں ہمہ تن گوش ہوں آپ کیلئے وہ بولی۔

''میرا نام محمودہ ہے لیکن میں چار بھائیوں کے بعد پیدا ہوئی تھی تو مجھے گھر والے شہزادی کہتے تھے۔

گاؤں میں پرائمری سکول تھا۔ جب میں نے پانچویں جماعت پاس کرلی تو ابا نے کچھ زمین فروخت کر کے قصبے میں مکان لے لیا تا کہ میں وہاں کے ہائی سکول سے میٹرک کرسکوں۔

بھائی مجھ سے بڑے تھے۔ میں سارے گھر بلکہ سارے خاندان کی آنکھوں کا تارا تھی۔ ابا کی کوئی بہن نہ تھی اماں کی بھی نہ تھی۔

لہٰذا انہوں نے بہن اور بیٹی سب کا پیار مجھ پر نچھاور کیا۔ میں کلاس میں اول آتی، استانیاں بھی میرا خیال رکھتیں، کھیلوں میں ڈرامے میں سب سے آگے آگے۔

میرا بچپن پہاڑی ندی کی طرح اچھلتے کودتے پتھروں کو پھلانگتے رکاوٹوں سے ٹکراتے اور پانی کے تیز بہاؤ کی طرح گزر گیا۔ ایسا کہ پھر صرف یاد کی ناؤ باقی رہ گئی وہ بھی حادثوں سے ٹوٹی پھوٹی۔

کیسا خوبصورت زمانہ کتنے مخلص اور پیارے لوگ میرے اردگرد تھے۔ اب

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی 'الفت' کے رات دن

لیکن وہ جا چکے ہیں واپس نہ آئینگے۔'' میں نے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔

''پھر ایک ایک کر کے بھائیوں کی شادیاں ہوگئیں، چھوٹی بھابی نے میرے بھائی سے کہا کہ اپنی زمین الگ کرلو ہم نے اکٹھے نہیں رہنا۔ یہ خوشیوں کے میلے میں غم کا پہلا پتھر تھا۔ ہم سب حیران رہ گئے کہ وہ ہمارے چچا کی بیٹی تھی۔

ابھی تو چچا اور ابا کی زمین بھی سانجھی تھی، بیٹا کیسے الگ کرلے گا۔ لیکن چچا نے بھی بیٹی کا ساتھ دیا۔ خاندان کے بڑے مل کے بیٹھے کہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جائے۔ ابا کے انکار کی صورت میں چچا نے کہا کہ پھر میری بیٹی کو طلاق دیدیں۔ ابا اس انتہائی صورت حال کیلئے تیار نہ تھے۔

پہلے زمین کا بٹوارہ ہوا۔ جس زمین سے نہر گزرتی تھی وہ چچا نے پسند کرلی۔ بھائی کیا الگ ہوا زندگی ایک مسلسل آزمائش کی گردش میں آ گئی۔ خاندان میں لڑکیاں موجود تھیں۔ لیکن میری امی ابا دونوں ہی اس

حادثے سے سہم گئے تھے ۔ باقی بھائیوں کی شادیاں غیروں میں کر دیں۔صلہ رحمی کا ایک تقاضا پورا کر لیا تھا وہ ہی کافی تھا۔

زمرد میری ہم جماعت تھی۔ بڑی پیاری اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی اس نے سب کے زخموں پر مرہم رکھا، سبھی کا خیال رکھتی تھی۔ اپنوں کی مخالفت اور غیروں کی الفت دونوں دیکھ لیں۔ پھر زمرد کے خاندان سے میرے لئے رشتہ آیا۔گھر والوں نے ہاں کر دی۔ زمرد بھابی نے بہت کہا کہ لڑکا کراچی ہوتا ہے آئے تو مل لینا مگر میں نے انکار کر دیا کہ جو قسمت میں ہے مل کر رہے گا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں ٹیچر ٹریننگ یا کوئی کورس ضرور کروں لیکن ابا جی کہنے لگے پتر اب اگلے گھر جانے کی تیاری کر اور خاندان کو جوڑ کر رکھنے کی خدمت کرنے ،صبر کرنے اور راضی بہ رضا رہنے کا کورس سیکھ لے زندگی میں یہ بہت اہم سبق ہے۔

شادی ہو کر میں کراچی چلی گئی۔ میرا شوہر بہت معمولی شکل وصورت کا تھا، اس نے بھی میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی اور ایک فیکٹری میں گاڑی چلاتا تھا۔ میں نے محلوں کے خواب تو نہ دیکھے تھے لیکن ڈھائی مرلے کا فلیٹ جہاں ہوا بھی اپنی مرضی سے آتی تھی، اسکا تصور بھی نہ کیا تھا۔

بچپن میں گاؤں کی کھلی فضا، کھیت، ہرے بھرے پھلوں کے باغ سبزیوں کی پیلیاں (کھیت) شریر ہوائیں، گھنے سایوں والے درخت، جوانی ایسے قصبے میں گزری جہاں سبھی ایک دوسرے کی عزت کرتے، ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی صاف ستھرا علاقہ تھا امن وامان بہت تھا۔ میں برقعہ لے کر بے دھڑک بازار جاتی اور سارے گھر کا سودا لے آتی ۔لیکن عروس البلاد شہر کراچی .....جس کا نام تھا روشنیوں کا شہر..... وہاں یہ گھٹن زدہ زندگی.....میرے دل کی کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی۔ میں ادب کی دلدادہ شاعری اور مطالعے کی شوقین لیکن میرے شوہر نے کبھی مجھے کتاب تو کیا اخبار رسالہ یا تحفہ لا کر نہ دیا۔ایک کمرے کا فلیٹ تھا۔ سارا دن اس میں گزارنا مجھے یوں لگتا کہ میں اس پنجرے میں قید پرندہ ہوں۔

قفس میں مجھ سے رو دادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

زمرد بھابی خط لکھتی کہ ہم تمہیں ملنے آئیں، یا تم آؤ گی ۔تم تو پیا کے سنگ ایسی گئیں کہ سب کو بھلا دیا۔ میں خط پڑھ کر رو دیتی اب کیا لکھوں ۔میرے شوہر قاسم کا خاندان اگر کوئی تھا تو وہ لوگ اٹک میں رہتے تھے کبھی کوئی کراچی میں آیا نہ میں کسی خاندان کو جوڑ کر رکھتی اور کسی کی خدمت کرتی..... بھلے سسرال جیسا بھی ہو کوئی ہو تو سہی یہاں تو سناٹا تھا۔

کھلا خرچ اس نے کبھی میرے ہاتھ پہ نہ رکھا نہ میں نے مانگا، جن کاغذوں میں اخباروں میں سودا لاتا میں وہی پڑھنے لگ جاتی، کتابوں کو ترس گئی۔ایک دن میں نے کہا کہ دو آنے کا اخبار آتا ہے اتوار کا اخبار تو لا دیں بولا:

تو نے اخبار پڑھ کر کیا کرنا ہے سیاستدان بننا ہے؟ شریف عورتیں اخبار نہیں پڑھا کرتیں۔

مرد جو بھی کہہ دے کیا وہ عورت کی ''تقدیر'' بن سکتا ہے یا بن جاتا ہے! اس کے بعد میں نے کبھی فرمائش نہیں کی چھ سال گزر گئے نہ مجھے اولاد کی خواہش ہوئی نہ اس نے کبھی ذکر کیا، پتہ نہیں میرا اور قاسم کا رشتہ کیا تھا۔ پھر اللہ نے میری گود ہری کر دی۔ باسم میرا بیٹا کیا آیا امنگوں کی ایک دنیا رنگین دنیا میرے اردگرد آباد ہو گئی۔

چھ سالوں بعد میں واپس نارووال آئی بہت کچھ بدل گیا تھا۔ ابا دمے کے ہاتھوں بستر سے لگ گیا اور اماں کو جوڑوں کا درد لے بیٹھا دونوں ایک کوٹھری میں پڑے رہتے.....

مجھے شوق تھا کہ میں واپس گاؤں جاؤنگی تو نہ جانے کونسی رونق اور خوشی میری منتظر ہو گی لیکن عجیب سی بے رخی سرد مہری خاموشی اور نیم تاریکی رشتوں میں اور فضا میں در آئی تھی، کسی کی نظر لگ گئی تھی، ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ابا کہتے کہ ہمارے بڑوں کی بد نیتی منافقت اور غلط فیصلوں نے ہمارے دلوں کا اطمینان چھین لیا ہے، رفتہ رفتہ برکت اٹھ گئی ہے، ہم لالچی ہو گئے ہیں، اللہ بڑا مہربان ہے پھر بھی ہمیں نعمتیں دیئے چلا جاتا ہے جیسے تمہیں بیٹا دیدیا۔

دونوں باسم سے کھیلتے، پھر اچانک کراچی سے تار آیا کہ قاسم کے

ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔

باسم نے تو ابا کہنا ابھی سیکھا ہی تھا۔ وہ جیسا بھی تھا میری زندگی کا حصار تھا میں اس کی ذمہ داری تھی وہ میرے بچے کا باپ تھا پھر تو سچ مچ زندگی..... زندگی نہ رہی .....لیکن خوشی صرف باسم کی مسکراہٹ دیکھ کر ہوتی۔

میں نے ایک سکول میں نوکری کرلی۔ بچہ زمرد بھابی کے پاس ہوتا۔ پھر میں نے اسے بھی داخل کروادیا۔ اکیلی ماں .....بچوں کو کیسے پالتی ہے! جب میرے بھائیوں کے بچے اُن سے لپٹ جاتے، وہ ان کیلئے مٹھائی کا تحفہ لاتے تو باسم حیران ہوکر مجھے پوچھتا کہ اماں میرا ابا کہاں ہے وہ کب مٹھائی لے کر آئے گا۔

میرا کلیجہ کٹ جاتا، زمرد میرے بھائی سے کہتی کہ یتیم بھانجا ہے ہمیشہ دو چیزیں لایا کرو اور پہلے باسم کو دیا کرو۔

عورت میں بڑی طاقت ہوتی ہے زمرد کی وجہ سے نوید بھائی نے ہمیشہ ہم دونوں کا بہت خیال رکھا۔ کئی لوگوں نے کہا کہ میں نکاح ثانی کر لوں شادی کرلوں گھر بسالوں لیکن اس نام پر نہ دل دھڑکا نہ آنکھ شرمائی نہ کوئی خواب جگمگائے تو ایسی شادی کا کیا فائدہ! میری شادی تو گوبھی کا باسی پھول تھی۔ اس میں خوشبو تو نام کو نہ تھی۔

لیکن پروردگار نے بیٹا دیدیا جواب میری زندگی کا سہارا تھا۔ میں نے بیس سال اپنے نفس کو مارا، محنت کی، والدین کی خدمت کی۔ وہ دونوں ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے، نہ میرے سہاگ کی خوشی دیکھی نہ میرے بیٹے کی کامیابی ..... بیج اچھا ہو تو فصل اچھی ہوتی ہے۔ پھل پھول عمدہ آتے ہیں ورنہ جیسے ہم جتنی مرضی کھاد دیں حفاظت کریں پانی دیں کیڑوں سے بچائیں لیکن بیج اپنا اثر دکھاتا ہے۔

''باسم کو میں نے برے ماحول سے، برے دوستوں سے بچایا، خواہشیں پوری کیں، پیٹ کاٹ کر پڑھایا لیکن بی کام کے بعد اس نے لمبی اڑان بھرنے کی سوچی کہ میں ایم بی اے کرنے آسٹریلیا جاؤنگا۔ ویزا، پاسپورٹ، فیس داخلہ میں اتنی رقم کا انتظام کیسے کرتی لیکن باسم کی ضد اصرار سے تکرار میں بدلتی گئی ابا نے مرنے سے پہلے میرے حصے کی زمین اور دو کمرے میرے نام کردیئے تھے اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ زیور بیچ کر پہلے ہی اس کی کتابیں اور فیس داخلہ بھجوائی تھی۔''

کہانی یہاں تک پہنچی تھی کہ مغرب کا وقت ہوگیا۔ ساجدہ میس سے کھانا لے آئی تھی۔ لیموں پانی بنایا اور ہم ڈرائینگ روم میں آگئے۔ روزہ افطار کیا نماز پڑھی۔ میں نے پوچھا رات کو ٹھہر سکتی ہو۔ گھر والے انتظار کر رہے ہونگے یا فون کردو۔

کہنے لگی فون کر دیتی ہوں، سوائے زمرد بھابی کے کون میرا انتظار کرتا ہے۔ اس نے گھر فون کر دیا۔ وہ تلاوت کرنے کے لئے بیٹھی تو میں نے کہا میں ذرا مریض دیکھ آؤں لیبر وارڈ فل تھا کال آسکتی تھی لیکن میرا دل محمودہ کی کہانی میں اٹکا ہوا تھا۔ آسٹریلیا کا نام سن کر میں جلدی جلدی ساری کہانی سننا چاہتی تھی۔ واپس آکر ہم نے وہیں سے کہانی کا سلسلہ جوڑا۔

''باسم سے سارے لاڈ دلار میں نے کیے، قربانی دی، اپنی جوانی صحرا کی دھوپ اور تپتی ریت پر تنہا چلتے ہوئے گزار دی، پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔ لیکن باسم اپنے باپ کی طرح تمام جذبات، احساسات سے نا آشنا ہی رہا۔

دودھیال میں کوئی تھا ہی نہیں۔ ننھیال میں زمرد اور نوید ماموں کے علاوہ کوئی نہ تھا لیکن باسم کو محرومی کا احساس بہت رنجیدہ رکھتا۔ وہ اداس اور زود رنج بچہ تھا۔

کبھی کہتا یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ امی اس کو فروخت کر کے مجھے ویزا لگوا دو میں اس اجڑے تنہا اور بے کس ماضی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں، یہاں لوگوں کی رحم بھری نگاہیں اور ترس کھانے والے تاثرات اندر ہی اندر کچلتے رہتے ہیں، میری خودداری لہولہان ہوتی رہتی ہے۔

وہ کہتا، امی آخر یہ تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ کس کا باپ زندہ رہے گا اور کس کا رخصت ہوجائیگا پھر دنیا والے ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ میں اسے گلے لگا لیتی اور بتاتی کہ بیٹا ایسی باتیں نہ سوچا کرو سرکار دو عالمؐ جو پروردگار کے محبوب تھے یتیم پیدا ہوئے تھے انہوں نے تو اپنے والد کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔

وہ کہتا کہ بظاہر لوگ ہمدردی جتاتے ہیں لیکن جب کہتے ہیں ہائے ہائے جانے بھی دو یتیم ہے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کا اتنا ثواب ہے صدقہ بھی اسی پہ لگتا ہے.....تو دل چاہتا ہے کہ وہ صدقہ اٹھا کر انکے منہ پر مار دوں۔ میں سمجھاتی ،اچھا تم پڑھ لکھ کے جب کچھ کرنے کے قابل ہو گے تو ان ساری روایات ، رسومات کو بدلنے کی کوشش کرنا،مگر اس کی حالت دگرگوں ہوتی گئی۔اس نے مزید پڑھنا چھوڑ دیا دوستوں کو بھی نہ ملتا،کھانا بھی کم کر دیا۔میں نے اپنی ضد چھوڑ دی۔مکان اور زمین کا سودا کیا کہ اب دونوں میں سے ایک چیز رہنی تھی یا جائیداد یا اولاد.....

ویزا لگ گیا، داخلہ ہو گیا اور باسم آسٹریلیا کے شہر سڈنی پرواز کر گیا۔ جاتے ہوئے بہت خوش تھا میں اتنی ہی اداس تھی میں رو رہی تھی، بڑھاپا زار و زار رویا اور نوجوانی کھلکھلا کر ہنسی.....اس کو منزل مراد دکھائی دے رہی تھی۔اور میں تاریک آنے والی رات کی چاپ سن رہی تھی۔

کچھ عرصہ اس کے فون آتے رہے پھر کبھی کبھار خط آجاتا اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پڑھائی چار سال کی تھی کہتا تھا پی آر مل جائیگی تو امی آپ کو بلالوں گا۔

لیکن اس نے سارے رابطے توڑ ڈالے جو جو لوگ جن کے عزیز وہاں رہتے ہیں میں انکو جا جا کر ملتی ہوں اور باسم کا فون نمبر کالج کا پتہ دیتی ہوں کہ کوئی مجھ کو اس کی خبر لا دو میں بن مچھلی کے تڑپ رہی ہوں لیکن لوگ تسلی دیتے ہیں، کچھ نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ کر چلے جاتے ہیں پھر کوئی وعدہ پورا نہیں کرتا۔میں اسے فون پر کہتی تھی۔

اجنبی لوگوں میں ہو اور مجھ سے اتنی دور ہو
اک پریشانی رہا کرتی ہے روزانہ مجھے

لیکن دوسروں کا دکھ

اپنے درد پہ ہائے ہائے
میرے درد پر لب خاموش
وہ ڈوبیں تو دوڑو لوگو
ہم ڈوبیں تو سب خاموش

زمین اور مکان کے بعد میں بے گھر اور بے ردا ہو گئی۔ بھابی زمرد کے برآمدے میں چارپائی ڈال لی تھی۔اس کے پاس دو کمرے تھے ایک میں میاں بیوی دوسرے میں چار بچے.....میری چارپائی کی جگہ نہیں تھی۔

نوکری کی ہمت نہ رہی.....سکول میں بچوں کو ٹافیاں اور کاپیاں پنسل فروخت کرنے لگی اور شام کو گھر پر جا کر قرآن پاک اور ٹیوشن..... رب قدیر کا شکر ہے کہ علم کی دولت پاس تھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑا۔جو بچیاں خرید نہیں سکتیں انکے پاس پیسے نہیں ہوتے میں ان کو وہ چیز فری میں دے دیتی ہوں۔

اب زندگی میں اس خوشی کے علاوہ کچھ نہیں بچا، دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے ہمیشہ اونچا، اعلیٰ ،خوش نصیب ، بابرکت ہوتا ہے یوں جائیداد بھی گئی اولاد بھی گئی.....

لوگ رشتے دار خاندان والے طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں کہ میں نے نادانی کی۔کہاں باسم جیسا بچہ جس کے سر پر باپ نہیں اور کہاں آسٹریلیا جا کر تعلیم حاصل کرنے کا خواب.....وہ تو بچہ تھا میں نے جائیداد کیوں بیچی۔مزے کی بات ہے کہ تسلی کے دو بول اور ایک وقت کا کھانا یا لباس تو ندارد ہے،لیکن لعن طعن.....تنقید،تبصرہ اور طنز کے تیروں سے سب کی زنبیل بھری ہوئی ہے جیسے راہ چلتے لوگ جاتے جاتے بیری کو دو پتھر مار دیں۔صحن کی بیری کو بھی لوگ نہیں چھوڑتے ، بھلا جس کے گرد چار دیواری نہ ہو اس کو کیسے بھول سکتے ہیں!

مجھے یہ بتائیں یہ دنیا ایسی کیوں ہے؟ آزمائش تو آنی ہے اس کو صبر کے ساتھ سہنا ہوتا ہے لیکن لوگ اس آگ پر ہر وقت تیل چھڑکنے کو تیار ہوتے ہیں۔ فالتو وقت ، زخم ، دانائی کا غرور، حسد اور تکبر..... انہوں نے انسانیت کو جہنم رسید کر دیا ہے۔''

رات کے دو بج رہے تھے۔تھوڑی دیر بعد سحری کے لئے اٹھ جانا تھا پہلے سوچا سو جائیں لیکن یہ دھڑکا کہ آنکھ نہ کھلے تو.....؟

چنانچہ ہم نے تلاوت کی،سحری کھائی،صبح کی نماز پڑھی اور سو گئے۔ نو بجے آنکھ کھلی، میں نے کہا محمودہ مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔کہنے لگی میں گھر جا رہی ہوں شام کو افطاری سے پہلے آؤنگی۔

میں سارا دن مریضوں میں مصروف رہی لیکن سوچوں پر محمودہ کی

آنکھیں اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی غم کی دھند، چہرے کی سلوٹوں میں زمانے بھر کی تلخیوں کی آمیزش .....تھکا تھکا لہجہ .....موتیوں کی طرح آبدار الفاظ چھائے رہے۔ میں انصاف نہ کرسکی، مریض کم تھے میں ایک بجے فارغ ہوکر آ گئی اور نماز کے بعد سوگئی۔

رات جاگنے کی وجہ سے جو اضطراب اور پژمردگی تھی دور ہوگئی شام کو محمودہ آ گئی۔ کہنے لگی میرا بیٹا باسم سڈنی آسٹریلیا میں ہے لیکن پچھلے دو سال سے میرا رابطہ نہیں ہے۔ میں دن رات دعائیں کرتی ہوں کہ یا اللہ وہ خیریت سے ہو مجھے اس کی کوئی خبر مل جائے۔ آپ حضرت یعقوبؑ کی جدائی اپنے بیٹے سے یاد کریں رو رو کر ان کی بینائی جاتی رہی۔ جب سے گیا ہے میری دنیا کی ہر خوشی اور رونق ساتھ لے گیا ہے نہ جانے وہ کس مشکل میں ہوگا۔ نہ کھانے میں مزہ ہے نہ سکون کی نیند آتی ہے۔ لوگ بھی مجھے ہی الزام دیتے ہیں کہ میں نے اسے جانے کیوں دیا۔ زندگی تو پہلے ہی کسی پہاڑ سے کم نہ تھی اب تو ہر طرف تاریکی ہے۔

تمہارے پاس اس کا کوئی کنٹیکٹ نمبر ہے مجھے دو میں وعدہ تو نہیں کرتی لیکن کوشش ضرور کرونگی۔

میں نے اس کا ایڈریس موبائل نمبر اس کے دوستوں کے نام اور ایک کا موبائل نمبر لیا۔ واپسی کی تاریخ پر ہم لوگ واپس میلبورن آ گئے۔ چند دن تو تھکن اور ملنے ملانے میں گذر گئے حتیٰ کہ میں باسم کے بارے میں تقریباً بھول گئی۔ ایک روز اپنی ڈائری میں سے کوئی نمبر دیکھنا تھا تو محمودہ اور باسم کا نام نظر آتے ہی ساری کہانی یاد آ گئی۔

دو چار لوگوں سے تذکرہ کیا۔ فون پر جواب ملا کہ یہ نمبر ڈس کنٹیکٹ ہوگیا ہے یعنی بند ہوگیا ہے۔ اس ایڈریس پر ایک خط لکھا کہ مجھے اس نمبر پر فون کرے۔ اس کے دوست رضوان کا نمبر ایک دن اتفاقاً مل گیا میں نے پوچھا تم رضوان ہو۔

جی.....آپ کون ہیں

آپ مجھے نہیں جانتے میرا نام ڈاکٹر نقوی ہے مجھے باسم کے بارے میں معلومات لینی ہیں۔

باسم کا نام سنتے ہی وہ خاموش ہوگیا۔

ہیلو.....ہیلو.....رضوان فون بند نہ کرنا پلیز مجھ سے بات کرو۔ ورنہ باسم کی ماں رو رو کر اپنی جان دے دے گی۔ اگر تم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو مجھے بتاؤ یا اس کا نمبر دے دو، ہیلو، ہیلو سن رہے ہو نا .....پلیز

ہیلو..... جی وہ لائن خراب تھی آواز آنا بند ہوگئی تھی۔ باسم کے ساتھ ایک حادثہ ہوگیا تھا۔ وہ چھ ماہ جیل میں رہ کر آیا ہے میں اس کا نیا نمبر آپ کو دیتا ہوں۔

کیا وہ کوئی جاب کر رہا ہے۔ پڑھائی مکمل کر لی ہے؟ بیمار تو نہیں ہے؟ یہ سارے سوال آپ اس سے خود ہی پوچھ لیں۔

فون پر باسم مل گیا۔

میرے دل کو انجانی سی راحت محسوس ہوئی جیسے میرا اپنا کھویا ہوا بیٹا مل گیا ہو۔ میں نے پوچھا باسم میں تمہاری امی محمودہ سے مل کر آ رہی ہوں تم کیسے ہو تمہارے لئے ایک پیغام ہے۔

میں بہت شرمندہ ہوں مجھے حالات نے اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ میں امی سے رابطہ کرسکتا۔ میری ماں ٹھیک تو ہے نا؟

تمہاری واپسی کی امید اور دیدار کا شوق اسے زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ اس کی زندگی میں جینے کی کوئی رمق باقی نہیں ہے۔

وہ رو پڑا.....معصوم بچے کی طرح سسکیاں لیتے ہوئے بولا کاش میں یہاں نہ آیا ہوتا۔ میں نے ماں کی جائیداد اپنی زمین سے جدائی گوارا کی اور یہاں ایسے بھنور میں پھنسا ہوں کہ کوئی کنارا نظر نہیں آتا۔

اچھا اب تم رونا بند کرو بہادر ہو اور واپس جانے کی تیاری کرو اس سے پہلے کہ تمہاری ماں کی آنکھیں روتے روتے بے نور ہو جائیں اسے جا کر مل لو۔

آپ اپنا تعارف تو کرائیں اور اپنا ایڈریس اور ای میل دیں میں ایک جاب کے سلسلے میں میلبورن آ رہا ہوں آپ سے ملوں گا۔

چند دنوں بعد وہ سچ مچ آ گیا میں نے اس کی رہنمائی کی کہ 19 نمبر ٹرام لے کر آخری سٹاپ پر اتر جانا بس دو منٹ کی واک پر میرا گھر ہے۔

معمولی سے لباس میں چہرے پر پردیس میں کھائی جانے والی

ٹھوکروں کی بے مروتی ،جگراتے ، بے وفائی ،خودغرضی کی تحریر لکھی تھی۔ اس نے اپنی کہانی سنائی۔

میں نے یہاں آتے ہی تین ماہ کے لئے انگلش سیکھنے کے کورس میں داخلہ لیا ۔اس کی کامیابی پر میرے داخلے کا انحصار تھا ۔ کھانا پینا کمرے کا کرایہ موبائل کیلئے کارڈ بس اور ٹرین کا کرایہ اس کے کم از کم ایک ہزار ڈالر ہر ماہ کا خرچہ تھا جن لڑکوں کے پاس ٹھہرا تھا انہوں نے کہا، بیکری ، دکانیں ، صفائی ، برتن دھونے کوئی بھی کام مل جائے تو پکڑ لو اتنے ڈالر آجائینگے کہ گزارا ہو جائے ورنہ یہ کمرہ بھی خالی کرنا پڑے گا۔ ہم کو ہر ماہ لینڈ لیڈی مہینے کے آخر میں ہی کرایہ لینے آجاتی ہے۔

لوگ وعدہ کرتے مگر کام نہ ملتا میں سارے لڑکوں کے لئے کھانا پکاتا، برتن دھوتا، جھاڑو دیتا، استری کرتا سارے گھر کی صفائی کرتا حتیٰ کہ ٹائیلٹ تک دھوتا کہ یہ مجھے نکال نہ دیں۔

ایک دن بیکری میں کام کیا تو اس کا مالک کہنے لگا کہ تمہارا کام مجھے پسند نہیں آیا کل سے مت آنا میں نے کہا آج کے پیسے دیدیں میں نے آٹھ گھنٹے کام کیا ہے پلیز اس نے کہا دفع ہو جاؤ ، یہ تو میں نے تمہارا ٹیسٹ لیا تھا، تم فیل ہو گئے ۔ میں روتا ہوا واپس آ گیا۔

ون وے ٹکٹ لیا تھا۔ رفتہ رفتہ پیسے ختم ہو رہے تھے ۔لڑکوں کو پتہ تھا کہ مجھے کام نہیں مل رہا لیکن مہینے کے آخر میں وہ مجھ سے ایک ہزار ڈالر لے لیتے ذرا بھی لحاظ نہ کرتے حالانکہ سب کام کر رہے تھے ۔بعض تو صرف کالج میں فیس دیتے ، حاضریاں لگتی رہتیں اور وہ سات دن کام کرتے ۔ڈے اینڈ نائٹ۔

بس چار یا پانچ گھنٹے سے زیادہ نیند بھی نہیں پوری ہوتی تھی ایک جاب سے آتے اور دوسری کی طرف چل دیتے۔ پھر مجھے ایک قصائی کی جاب ملی میں نے زندگی بھر چڑیا بھی نہیں ماری تھی ۔ میں نے خون دیکھا تو میرا دل خراب ہو گیا۔

پھر ایک ہوٹل میں برتن دھونے کی جاب ملی صرف ہفتہ اتوار رات کی شفٹ ۔تین بجے فارغ ہو کر گھر آتا کوئی بس نہ ملتی پیدل چل چل کر حشر ہو جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں امتحان میں فیل ہو گیا۔ اب ویزا خطرے میں پڑ گیا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ انڈر گراؤنڈ ہو جاؤ بہت لوگ ایسے رہتے ہیں پیسے اکٹھے کر لو ٹکٹ خریدو اور واپس چلے جانا۔

میں نے ڈرائیونگ سیکھی ، دوستوں نے بتایا کہ ٹیکسی چلانا سب سے آسان ہے ۔ پیسے بھی زیادہ اور ٹیکسی کی بھی بچت ہوتی ہے میں بھی لالچ میں آ گیا لیکن مقدر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے ۔ٹیکسی ڈرائیونگ لائسنس بڑی مشکل سے ملتا ہے جو پیسے کماتا وہ وہیں دے دیتا۔

لیکن دو دفعہ امتحان دیا فیل ہو گیا جس کے برتن دھوتا وہاں سے جھوٹا کھانا مل جاتا تو زہر مار کر لیتا، تاکہ کھانے کا خرچ کم ہو کبھی کبھی ماں کے ہاتھ کے پراٹھے اور لسی یاد آتی پاکستان یاد آتا تو یوں لگتا کہ وہ ایک جنت تھی جسے میں اپنے ہاتھوں سے چھوڑ آیا ..... واپس کس منہ سے جاؤنگا۔

گھر بیچ دیا ، زمین فروخت کر دی ، اب ماں کو کیسا بے سہارا کر دیا۔ شاید ماں راضی نہیں تھی اس لئے ہر دروازہ بند ملتا ہے ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ واپس چلا جاؤنگا۔ محنت مزدوری کر لوں گا ماں تو پاس ہو گی مل جل کر گزارہ کر لیں گے ۔لوگ بڑے سنگدل خودغرض اور طوطا چشم..... یہاں بھی اور وہاں بھی.....رحمدلی نہ جانے صرف کتابوں میں رہ گئی ہے۔

تیسری دفعہ امتحان پاس ہو گیا کسی کی ضمانت پر ٹیکسی مل گئی میں نے پھر لالچ کی جب ڈالر ہاتھ میں آئے تو ساری تکلیفیں بھول گئیں۔ سوچا ویزا اپلائی کرتا ہوں فیس کے پیسے جمع ہو گئے ہیں پڑھونگا اور ڈگری لے کر واپس جاؤں گا ۔بس قسمت کی خرابی دن رات ٹیکسی چلائی نیند پوری نہیں ہوئی میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا سر پہ چوٹ آئی پولیس آئی میرے کاغذات چیک ہوئے تو میرا ویزا نہیں تھا پہلے ہسپتال میں علاج ہوا کچھ پیسہ وہاں لگ گیا اس کے بعد مجھے جیل ہو گئی۔

وہاں جا کر میں نے سوچا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے میں دنیا کے پیچھے دوڑ رہا ہوں اور میں نے اپنے پروردگار کو بھلا رکھا ہے چنانچہ پہلے تو توبہ کی گڑگڑا کر معافی مانگی۔ پھر نمازیں شروع کیں ۔ جو سورتیں زبانی یاد تھیں ان کی تلاوت کی ۔ اسلامک فیڈریشن والے ہر اتوار کو جیل کا وزٹ کرتے ہیں ۔انہوں نے مجھے قرآن پاک دیا۔ میں

نے ترجمہ کے ساتھ زندگی میں پہلی بار تلاوت کی میری آنکھیں کھل گئیں۔
بہت رویا شروع سے ہی میں غلطی پر تھا ماں کی یاد بہت آتی لیکن میں رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔

ساری مصیبتوں کے بعد یہ سب سے بڑی مصیبت تھی لیکن شاید یہ آخری ہو میں نے رب کی رحمت کے دامن میں پناہ لے لی۔

چند دن پہلے ہی جیل سے آیا ہوں کہ آپ کا فون آ گیا اور اپنی والدہ کی خیریت کی اطلاع بھی مل گئی۔ اب آپ بتائیں ماں نے کیا پیغام دیا ہے۔

تمہاری ماں نے بس ایک جملہ کہا ہے باسم آجاؤ مجھے تیری ضرورت ہے۔ وہ یہ سن کر آبدیدہ ہو گیا۔

میں نے تسلی دی، کھانا کھلایا، کتابیں دیں اور پوچھا کہ کرایہ ہے، پاکستانی ٹریول ایجنٹ سے کہہ کر ڈالر کم کروائے ٹکٹ کا انتظام کیا۔

ایک خط لکھ کر محمودہ کیلئے چند تحائف، ایک سوئیٹر اور ایک پرس بھجوایا اور میرا بیٹا اسے ائیر پورٹ پر چھوڑ آیا۔

میں نے اسے تاکید کی کہ یہ ایک ہزار ڈالر ساتھ لیجاؤ یہ تمہاری حق حلال کی کمائی ہے یہ ایک لاکھ روپے پاکستانی بنتے ہیں یہ ماں کو جا کر دینا۔

مائیں تو ہمیشہ معاف کر دیتی ہیں وہ بہت خوش ہو گی اس کی خدمت کرنا، کہنا ماننا اس کے آگے اُف نہ کرنا اسے تنہا نہ چھوڑنا مجھ سے رابطہ رکھنا میں انشاءاللہ اگلے سال پاکستان آئی تو ضرور ملنے آؤنگی۔

اور جہاز فضا کی بلندیوں میں پرواز کر گیا۔

نوٹ: نام اور مقام سب فرضی ہیں۔

☆.....☆.....☆

دوپہر اور جگنو

اس کی بیوی اسے جگاتی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے،

کیا ہوا؟.....خیر تو ہے؟''

''چھ بج رہے ہیں اب اٹھ جایئے۔''

''اوہ میں سمجھا.....پھر کوئی بری خبر!''

وہ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔

''روز کہتا ہوں نیک بخت..... مجھے اس طرح نہ جگایا کرو''

''آپ تو یوں ہی بدک جاتے ہیں'' اس کی بیوی باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہتی ہے'' پتہ نہیں ہر وقت کیا ڈراؤنے خواب دیکھتے رہتے ہیں''

''خواب؟'' وہ خود سے سوال کرتا ہے'' تو کیا یہ سب خواب تھا.....مگر کیسا بھیانک، طویل اور مکروہ خواب'' ہاں! ہاں، یہ خواب ہی تو تھا۔ ایک ہولناک خواب!

رضائی میں لیٹے لیٹے وہ دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھنے لگتا ہے، اس کی بیوی نے بتایا کہ چھے بج گئے ہیں مگر ابھی چھے بجنے میں دو منٹ باقی ہیں، چھوٹی سوئی چھے کے ہندسے کو چھوڑ رہی ہے مگر ابھی چھے نہیں بجے..... یہ چھے اس وقت تک نہیں بج سکتے جب تک منجھلی بارہ کے نقطے کو نہ چھو لے، مگر تیسری ان دونوں سے بڑی.....صرف نام کی بڑی ہے، اسے بڑی پر ترس آنے لگتا ہے۔ اسے ایک ایک منٹ میں دائرے کا پورا چکر لگانا پڑتا ہے۔ چھوٹی اور منجھلی اس کے مقابلے میں کئی گنا کم کام کرتی ہیں لیکن ابھی ابھی جب گھنٹے بجیں گے تو اس کا سہرا ان دونوں چھوٹیوں کے سر ہوگا، جیسے وہ ان دونوں کی خادم اور ادنیٰ کنیز ہو۔ کتنی ناانصافی ہے کہ وہ خود تو آرام کرتی ہیں مگر اسے صدیوں کی مسافت کا کام نپٹانے پر لگایا ہوا ہے۔

رکنا، ٹھہرنا، اور آرام کرنا جس کے نصیب میں نہیں مگر اس کا رتبہ ان دونوں سے کم تر..... چھے بجتے ہیں؟

وہ ساتھ ساتھ گنتا جاتا ہے۔

اسے معلوم ہے کہ جب چھوٹی چھے پر اور بڑی بارہ پر ہو تو چھے ہی بجیں گے، لیکن پھر بھی اسے شک ہے کیا خبر گھڑی میں کوئی خرابی ہوگئی ہو اور آج وہ پانچ یا سات بجا دے، چھے تک گنتی پوری ہونے پر وہ اطمینان کا سانس لینا چاہتا ہے کہ اس کی نظر روشن دان پر لگے ہوئے خاکی رنگ کے کاغذوں پر پڑتی ہے، ان کھرچے ہوئے کاغذوں کو دیکھ کر اسے بلیک آؤٹ یاد آتا ہے، پھر اس کے کان میں سائرن کی آواز گونجتی ہے۔

''خندق..... دھماکہ.....خون..... لاشیں..... دھواں اور گھپ اندھیرا.....''

مگر یہ سب تو خواب تھا۔

''بنگلہ دیش''.....مکتی باہنی!!''

عجیب واہیات خواب تھا۔

لیکن یہ مکتی باہنی کیا ہوتی ہے یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے ذہن سے کیوں چپک گیا ہے! کہیں یہ خواب کی بجائے کوئی حقیقت نہ ہو کہ ہم جنگ ہار گئے ہیں.....اس کا دل ڈوبنے لگتا ہے، خدا کرے یہ خواب ہی ہو.....خواب کی کرچیاں اس کے دل کو لہولہان کرنے لگتی ہیں۔

اس کے ذہن میں توپ دغنے لگتی ہے'' شکست.....شکست..... شکست'' دھماکوں کا دھواں کم ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں لفظ ابھرتے ہیں۔

''پاسپورٹ..... بائیس خاندان ..... زر مبادلہ ..... بنگلہ

بندھو......قومی ملکیت......عوامی حکومت!''

عوامی حکومت کا خیال آتے ہی اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ خواب تھا، وہ بیوی کو بلا کر شک دور کرنا چاہتا ہے کہ گلی میں ہاکر کی آواز گونجتی ہے ''اخبار اے'' اس کا دھیان خواب کی باتوں سے ہٹ کر ہاکر نیوز ایجنٹ اور اخبار کے مالک کی طرف چلا جاتا ہے، اس لمحے اس کا بڑا بچہ اخبار لا کر سامنے رکھ دیتا ہے، وہ اخبار اٹھا کر دیکھنا چاہتا ہے لیکن کسی انجانے خوف سے اس کا ہاتھ لرز کر رہ جاتا ہے، پتہ نہیں آج کس ملک نے کس بڑی طاقت کے اشارے پر کس ملک پر حملہ کر دیا ہو؟

پتہ نہیں آج کسی ملک کی فوج نے وہاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا ہو اور کیا خبر وہ حکومت الٹے ہوئے تختہ کو پھر سیدھا کر کے اس پر بیٹھ گئی ہو، یا ابھی تک تختے پر پڑی ہو۔

نہ جانے آج کہیں ہوائی جہاز، ریل گاڑی یا بس کا حادثہ ہو گیا ہو یا کہیں طوفان اور زلزلے کی وجہ سے ہزاروں انسان موت کی نیند سو گئے ہوں کسی کارخانے میں آگ لگ گئی ہو یا کسی دکان کو لوٹ لیا گیا ہو، کسی کی بہو بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہو یا اغوا کر لی گئی ہو۔

نہ جانے آج کس وجہ سے بھائی نے بھائی کا خون کر دیا ہو۔ باپ نے بیٹے کو عاق کر دیا ہو اور کیا پتہ جب وہ اخبار اٹھا کر دیکھے اس میں جنوری ۱۹۷۲ء کے بجائے کوئی اور تاریخ چھپ گئی ہو۔

مگر نہیں......وہ تو خواب تھا......طویل بھیانک اور مکروہ خواب!

اسے شک دور کرنے کے لئے اخبار دیکھنا چاہیے۔

وہ اخبار دیکھتا ہے۔

اخبار میں سانپ لپٹا ہوا ہے، وہ چیخنا چاہتا ہے لیکن سانپ اس کے گلے کے گرد کنڈلی مار لیتا ہے اور اپنی دوشاخی زبان سے اس کا دماغ چاٹنے لگتا ہے، پھر اتر کر سیمنٹ کنکریٹ کے پکے فرش میں گھس جاتا ہے۔

وہ اخبار کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے، اخبار کورے کاغذوں کا پلندہ ہے اس پر کوئی سرخی، کوئی خبر، کوئی لفظ نہیں ہے، وہ گھبرا کر آنکھیں ملتا ہے کہیں وہ اچانک بصارت سے محروم نہ ہو گیا ہو۔

وہ اخبار سے منہ ڈھانپ لیتا ہے۔

اس کے کانوں میں لاکھوں سسکیوں، آہوں، چیخوں اور دھماکوں کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں، وہ دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے، پھر پورے زور سے چیخ کر کہتا ہے۔

''ہاں ہم ہار گئے، ہار گئے!''

اس کے ساتھ اس کی آنکھ سے کوئی آنسو نہیں گرتا۔

مگر اخبار کے اوراق پر آہستہ آہستہ الفاظ ابھرنے لگتے ہیں، سرخیاں شہ سرخیاں، تصویریں، خبریں، کالم، کارٹون، نظمیں اداریہ اور جنگی قیدیوں کی فہرست!

وہ خبروں کی سرخیاں یوں جلدی جلدی دیکھتا ہے جیسے بہت سے زخمیوں اور مرنے والوں میں اپنی لاش تلاش کر رہا ہو، دوسرے کمرے کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آتی ہے وہ اچھل پڑتا ہے۔

پھر چیخ کر کہتا ہے۔

''ہزار بار کہا ہے دروازہ آہستہ بند کیا کرو۔''

کچھ عرصہ سے اچانک شور یا آہٹ سے اُس کا دل بری طرح دھڑکنے لگتا ہے، اس کے قریب سوکھا پتہ گرے تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے، ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا ہے کہ اس کا دل ٹھیک ہے، البتہ اسے اپنے دماغ کو صاف رکھنا چاہیے۔

دروازے پر کسی گداگر کی صدا گونجتی ہے ''اللہ کے نام پر روٹی کا سوال ہے''

اس کی چھے سالہ بچی منہ ہاتھ دھو کر جلدی جلدی آتی ہے اور باورچی خانے سے روٹی لے کر دروازے کی طرف جاتی ہے وہ تڑپ کر بستر سے نکلتا ہے اور بھاگ کر دروازے کی طرف آتا ہے، گداگر ابھی تک بچی سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کا حلیہ اور لباس بڑا پُر اسرار ہے اس کے کندھے پر لمبے لمبے تھیلے لٹک رہے ہیں اور جیسے وہ ابھی ابھی بچی کو کلوروفارم سنگھا کر اور اپنے تھیلے میں ڈال کر غائب ہو جائے گا، وہ لپک کر بچی کو بازو سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لاتا ہے پھر بیوی سے الجھ پڑتا ہے۔

''تمہیں یعقوب علی کی بچی کے اغوا کا قصہ بھول گیا ہے، کیوں

بچی کو خیرات دینے کے لئے بھیجتی ہو۔''

نہا دھو کر جب وہ ناشتہ کرنے بیٹھتا ہے پھر اخبار اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے۔

''بیوی نے شوہر کو کھانے میں زہر دے دیا''

ڈبل روٹی کا ٹکڑا اس کے منہ میں ہے لیکن وہ چبا نہیں سکتا۔ اسی لمحے اس کی بیوی اندر آتی ہے۔ ''آپ کھاتے کیوں نہیں؟''

اس کا شک یقین میں بدل جاتا ہے وہ ناشتے کی چیزیں بیوی کے منہ پر دے مارنا چاہتا ہے لیکن پھر اسے ہنسی آجاتی ہے۔

اس کے دفتر جانے سے پہلے بچے سکول چلے جاتے ہیں لیکن وہ اس کا ذہن بھی ساتھ لے جاتے ہیں، سکول کا راستہ خطرناک ہے، سڑکوں پر تانگوں پر، بسوں اور کاروں کا دریا بہتا ہے۔ اس نے کئی بار سوچا ہے کہ بچوں کو موٹر سائیکل پر خود سکول پہنچایا کرے، لیکن اسے خوف آتا ہے کسی بچے کی ٹانگ پہیے کی تاروں میں نہ پھنس جائے، موٹر سائیکل کسی بس یا ٹرک سے نہ ٹکرا جائے، ٹرک سے موٹر سائیکل ٹکرانے اور اپنے بچوں کے اعضاء سڑک پر بکھرنے کا تصور کر کے وہ کانپ جاتا ہے اور اب تو ڈاکٹر نے اسے موٹر سائیکل چلانے سے منع کر دیا ہے، وہ خود بھی کئی دنوں سے بس یا رکشہ سے دفتر جاتا ہے۔

دفتر جانے سے پہلے اسے قریبی دکان سے گوشت یا سبزی لانا ہوتی ہے، وہ لپک کر گوشت کی دکان پر پہنچتا ہے، اس نے ایک بار اخبار میں کتوں کا گوشت فروخت ہونے کی خبر پڑھی تھی دنبے تو آسانی سے پہچانے جا سکتے ہیں مگر کتوں اور بکروں میں تمیز کرنے کے لئے اسے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔

گھر سے نکلنے سے پہلے اس کی بیوی شاپنگ کے لئے اجازت مانگتی ہے۔ وہ اجازت دے دیتا ہے لیکن اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ گلی کے موڑ پر وہ مڑ کر حسرت بھری نگاہ اپنے مکان پر ڈالتا ہے، شاید وہ آخری بار اپنے گھر سے جا رہا ہے..... کیا معلوم وہ جس بس میں سوار ہو وہ حادثے کا شکار ہو جائے۔ جب اس کی لاش گھر لائی جائے اس کی ٹانگیں کٹ چکی ہوں، کھوپڑی کے دو حصے ہو گئے ہوں اور سڑک سے گھر تک کا سارا راستہ اس کے خون سے سرخ ہو گیا ہو۔ پھر اسے اپنے بچوں اور اپنی بیوہ، اپنے رشتہ داروں اور اپنی انشورنس پالیسی کا خیال آتے ہی پریمیم، تنخواہ اور گھر کے اخراجات کا حساب کرنے لگتا ہے۔

جلدی ہی اسے بس مل جاتی ہے۔ لیکن وہ آدھا گھنٹہ دیر سے دفتر پہنچتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کا سپرنٹنڈنٹ اور صاحب بہت دیر سے دفتر آتے ہیں لیکن پھر بھی وہ خوف زدہ ہے کہ کیا معلوم اس کی جواب طلبی کے لئے ان میں سے کوئی آج جلدی دفتر آ گیا ہو۔

آفس ٹیبل پر بیٹھتے ہی اس کی نظر اپنے نام ایک خفیہ خط پر پڑتی ہے اور جیسے کسی نے ملازمت کا دروازہ زور سے بند کر دیا ہو، اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

کل وہ دو گھنٹے کی چھٹی لے کر ہسپتال گیا تھا وہاں رش ہونے کی وجہ سے دفتری اوقات میں واپس نہیں آ سکا تھا۔

پچھلے ہفتے اس کی میز سے ایک فائل چوری ہو گئی تھی۔

جنگ سے پہلے بڑے صاحب کا لڑکا ولایت سے لوٹا تھا تو وہ بیوی کی علالت کی وجہ سے بروقت مبارکباد دینے نہیں جا سکا تھا۔

پچھلے برس آڈٹ والوں نے اس کے حساب کتاب میں غلطیوں کی نشان دہی کی تھی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ خفیہ (CONFIDENTIAL LETTER) کھولتا ہے۔ یہ اس کی ترقی کے لئے دی ہوئی درخواست کا جواب ہے

''فی الحال یہ ممکن نہیں''

اس کی جان میں جان آتی ہے، اسے یہ سوچ کر بے حد اطمینان ہوتا ہے کہ وہ خط اس کی جواب طلبی یا برطرفی کا نہیں ہے۔

بارہ بجے کے قریب اسے اپنا گھر، بیوی اور بچے یاد آتے ہیں۔

کسی بچے کا سکول سے لوٹتے ہوئے ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو!

اس کی عدم موجودگی میں کوئی ناپسندیدہ رشتہ دار مرد، مہمان بن کر گھر نہ آ گیا ہو!

بیوی شاپنگ کر کے لوٹنے کی بجائے کسی کے ساتھ نہ چلی گئی ہو!

اس کا جی چاہتا ہے دفتر سے چھٹی لے کر فوراً ہسپتال پہنچے جہاں

اس کا حادثے میں زخمی ہونے والا بچہ آخری سانسیں لے رہا ہے لیکن فوراً ہی اسے خیال آتا ہے کہ اتنی دیر میں اس کی بیوی بھاگ جانے میں کامیاب ہو جائے گی، اسے سب سے پہلے سٹیشن یا بس کے اڈے پر پہنچنا چاہئے، ڈاکٹر کی ہدایات یاد آتے ہی وہ اپنی خود ساختہ پریشانیوں کو ذہن سے جھٹکنا چاہتا ہے کہ کنپٹی پر درد کی شدید ٹیس محسوس ہوتی ہے، کئی دن سے درد کی یہ لہر سر کے پچھلے حصے سے اٹھ کر کنپٹی اور بائیں آنکھ پر آ کر رک جاتی ہے، رضا صاحب کو بھی پہلے پہلے ایسی ہی شکایت تھی، لیکن دماغ کی رگ پھٹنے سے انکا انتقال ہو گیا تھا۔

درد کی لہر تمام ہو جاتی ہے، لیکن وہ اس درد سے اس قدر پریشان ہے کہ دو گھنٹے کی چھٹی لے کر ہسپتال کا رخ کرتا ہے، ہسپتال کے راستے میں اسے ہر برقعہ پوش عورت پر اپنی بیوی کا گمان ہوتا ہے، لیکن دماغ کی رگ پھٹ جانے کے خوف سے وہ جلدی جلدی ہسپتال پہنچنا چاہتا ہے۔

ہسپتال سے سکون اور نیند کی گولیاں لے کر وہ سیدھا بازار چلا جاتا ہے، بچوں کے ریڈی میڈ خوبصورت کپڑوں کی دکان دیکھ کر اسے اپنی بچی یاد آتی ہے، وہ بچی کے لئے ایک خوبصورت فراک پسند کرتا ہے، لیکن پیسے دینے سے پہلے اسے خیال آتا ہے کیوں نہ وہ گھر جا کر پہلے بچی کی خیریت معلوم کر لے، وہ فراک چھوڑ کر سیدھا گھر پہنچتا ہے۔

بیوی کھانا لاتی ہے، بچے سکول، کھیل، کتابوں اور امتحانوں کی باتیں کرتے ہیں اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب کبھی درد کی لہر اس کی کنپٹی تک نہ آئے گی۔

لیکن رات کو جب وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹتا ہے نظر نہ آنے والے ان گنت زہریلے چیونٹے اس کے جسم سے چمٹ جاتے ہیں پھر اس کے جسم اور کھوپڑی میں سوراخ کر کے اندر گھس جاتے ہیں، وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ پھر خواب آور گولیاں کھا لیتا ہے۔

اب اسے نیند آنے لگتی ہے لیکن وہ اس نیند سے بے حد خوف زدہ ہے، یہ موت ایسی نیند زبردستی اس پر مسلط ہوتی جاتی ہے، وہ اٹھ کر بھاگنا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنا چاہتا ہے۔ ''مجھے اس نیند سے بچاؤ'' مگر وہ حرکت نہیں کر سکتا چیخ اس کے گلے میں اٹک کر رہ جاتی ہے، ایک دم گھونٹنے والا دھواں اس کے چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ اس کے دماغ میں توپ سی دغنے لگتی ہے ''سقوط..... سقوط..... سقوط'' دھواں گہرا ہو جاتا ہے کلوروفارم کی سی بو سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے، اس کے دماغ کا آپریشن ہو رہا ہے۔

اس کے جسم کے سارے اعضاء الگ الگ کر دیئے گئے ہیں، دونوں ٹانگیں مرجھائی مرجھائی کونے میں پڑی ہیں، دونوں بازو میز پر رکھے ہیں، اس کی کھوپڑی چیر کر اس میں سے موٹی موٹی گردنوں والے چیونٹے نکالے جا رہے ہیں وہ میز سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور خود بھی چیونٹوں کو چن چن کر نکالنا چاہتا ہے، مگر ڈاکٹر اسے منع کر دیتا ہے، ٹرے میں اس کا دل پڑا دھڑک رہا ہے، قریب ہی ایک بوتل میں اس کی روح کلبلا رہی ہے، وہ بوتل کا ڈھکنا کھول دینا چاہتا ہے لیکن نرس بوتل چھین کر الماری میں بند کر دیتی ہے۔

اسی لمحے ڈاکٹر خوش ہو کر کہتا ہے:

''یہ رہا درد''

''ڈاکٹر درد کی چمٹی سے پکڑ کر اسے دکھاتا ہے، یہ ایک چھوٹا نوکیلا سا پتھر ہے۔ سیاہ..... بھورا..... یا شاید گہرے سبز رنگ کا۔

ڈاکٹر کہتا ہے:

''یہ درد ہے..... یہ تمہاری کھوپڑی سے نکالا ہے۔ آج کل جو ہوا چلتی ہے، اس میں ایسے بہت سے باریک باریک ذرات ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ کھوپڑی میں جمتے رہتے ہیں اور پھر درد کا نوکیلا پتھر بن جاتے ہیں، تمہیں آئندہ احتیاطاً سانس نہیں لینی چاہئے۔''

اس کی بیوی اسے جگاتی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

''کیا ہوا..... خیر تو ہے؟''

''چھے بج رہے ہیں اب اٹھ جایئے''

''اوہ..... میں سمجھا شاید پھر کوئی بری خبر.....؟''

وہ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔

☆.....☆.....☆

پسِ آئینہ

چمکدار گندمی رنگت کے ساتھ کٹورا سی آنکھیں جن میں ہر وقت شوخی سی ہلکورے لیتی گیتی آرا کی تھیں۔ بال اس انداز کے تھے جیسے کسی نے بڑی مہارت سے رولر لگا کر سیٹ کیے ہوں جس کی اونچی سی پونی اسکے ہر وقت متحرک رہنے سے ہلتی رہتی۔

وہ چودہ سال کی تھی، پارہ اسکے اندر کوٹ کوٹ کر جیسے بھرا تھا۔ زرینہ اور حیات خان کی وہ سب سے بڑی اولاد تھی۔ اس کے بعد دو بھائی اور تھے لیکن زرینہ کی نگاہ جتنی کڑی گیتی آرا کے لئے متحرک رہتی اتنی اس سے چھوٹے بیٹوں کے لئے نہیں تھی۔ حیات خان اسکے برعکس گیتی آرا کو اپنی لاڈو پری کہہ کر خوب ناز اٹھاتا تھا۔ باپ ہی کی شہ پر وہ ہر وقت چنچل موڈ میں رہتی تھی۔ زرینہ کی بھی جان تھی وہ لیکن دور اندیش ماں تھی، لاڈ پیار اس پیمانہ پر کرتی تھی جہاں تربیت کے سانچے کو رگڑ نہ لگے اور گیتی آرا ایک قابل اور صابر وجود میں ڈھل جائے۔

حیات خان، گیتی آرا کے ابو کیا کام کرتے تھے، یہ گیتی آرا کو کبھی نہ پتہ چلا۔ بس ہر کچھ عرصہ بعد وہ کبھی دنوں، ہفتوں یا مہینوں کے لئے گھر سے غائب ہو جاتے۔ امی نے کبھی اس بات کا جواب نہ دیا کہ ابو کہاں جاتے ہیں۔ ابو گھر سے جاتے اور زرینہ کا بیٹی کے لئے ٹریننگ پیریڈ شروع ہو جاتا۔ اسکول سے آ کر اسے کچھ دیر آرام اور کھانے کے بعد ماں سے سلائی کا سبق لینا ضروری تھا، جس میں وہ اچھی شاگرد تھی لیکن مجال ہے جو اسکا دل لگتا ہو۔ اسکول میں کم نمبر لینے پر ماں کو کبھی گیتی آرا پر غصہ نہ آیا لیکن باورچی خانہ میں مصالحوں کی گندی برنیاں دیکھ کر اس نے گیتی آرا کو خوب سرزنش کی۔

''گیتی پیارے نبیؐ کا فرمان ہے صفائی نصف ایمان ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اس ہفتہ صفائی نہ کی تھی کہ دیکھوں تمہیں یہ سب دکھتا بھی ہے کہ نہیں۔ بڑے ہی افسوس کی بات ہے تمہیں کیری میں مصالحہ ڈالتے یہ گندی ہوئی برنی دکھائی نہ دی۔''

زرینہ نے پلاسٹک کا سفید شفاف جار اسکے آگے کیا جس پر دھندلاہٹ نمایاں ہو رہی تھی، جس کے ڈھکنے پر گیتی کے مصالحہ بھری انگلیوں کے واضح نشانات تھے۔ کچھ دیر پہلے کھائی کیری کا سارا ذائقہ ماں کی ڈانٹ کھا کر گیتی کو تحلیل ہوتا لگا مگر پھر اس نے اس بات کو ذہن میں جما لیا کچن کی صفائی میں ثواب ہے۔

ایک دن اپنے سے چھوٹے شہروز کو اس نے مٹی بھرے جوتوں سے صحن میں پھرتے دیکھ کر دادی کے پاس جا کر بڑی غمگین شکل بنائی۔

''دادی امی سے کہو کہ ثواب شہروز کو بھی دلائیں، میں صفائیاں کر کے فارغ ہوئی ہوں، ثواب جمع کیا ہے اور شہروز کے بچے نے سارا گندہ کر دیا۔'' دادی جو کچھ دنوں پہلے ہی سوات سے آئی تھیں گیتی آرا کی شکایت پر ہنس پڑیں اور پھر انہوں نے جو کراری ڈانٹ شہروز کو پلائی تو گیتی آرا کے سینے میں جیسے کسی نے ٹھنڈا تا ردی۔

''دادی آپ بالکل ابو جیسی اچھی ہیں۔ امی تو.....''

گیتی آرا نے ادھوری بات چھوڑ کر ہونٹ بھینچ لیے۔ ماں کی شکایت دادی سے کرنی اسے صحیح نہ لگی۔ دادی نے پوتی کو غور سے دیکھا اور باداموں کا پیالہ اپنے آگے کر لیا۔ زرینہ سے فرمائش کر کے انہوں نے کھیر پکوائی تھی، اسکے لیے میوہ کاٹنا انہوں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔

زرینہ انکے دیور کی بیٹی تھی۔ حیات خان کا دل زرینہ پر عاشق تھا، اسلئے ہی زرینہ انکی بہو بنی ورنہ انکو بڑا ارمان تھا اپنے بھائی کی بیٹی سے حیات خان کی شادی کا..... بہت سگھڑ اور بہت خوبصورت، حیات خان کے سوا اسکا جوڑ کسی سے بجتا بھی نہ تھا، زرینہ میں کوئی خوبی اس سے زیادہ

کیا اس کے برابر بھی نہ تھی لیکن نہ جانے حیات کو وہ اپنی حیاتی کیوں لگنے لگی تھی اور پھر بیٹے ہی کے اصرار پر وہ بادل نخواستہ زرینہ کو بہو بنانے پر مجبور ہو گئیں۔

بیٹے کے بغیر بہو کے ساتھ اپنے آبائی علاقے سوات سے دور وقت گزارنا انکو کٹھن لگتا تھا۔ انکے آنے کے دو ہی دن بعد حیات خان غیر متوقع طور پر گھر سے چلا گیا۔

''اری یہ جاتا کہاں ہے، ہر کچھ عرصہ بعد غائب ہو جاتا ہے، کچھ پوچھو تو یہ ہی کہتا ہے مالکوں کے کام میں مصروف تھا، کہاں کام کرتا ہے، کیا کام کرتا ہے'' حیات خان کی ماں نے ترچھی نگاہ کر کے زرینہ سے پوچھا تو حیات خان کی کتابوں کی الماری صاف کرتے اسکے ہاتھ لمحہ بھر کو تھمے، اس نے ساس کو دیکھا جس کے چہرے پر اولاد کے لئے تفکرات کا جال بنا تھا، یہ حیات کی ماں تھی محض اس کی ساس نہ تھی اور حیات میں اس کی حیات تھی، سو باوجود اس حقیقت کو جاننے کے کہ وہ پانچ بہوؤں میں سے ایسی بہو ہے جو ساس کو پسند نہیں، وہ دھیمے قدموں چلتے ساس تک آئی۔

''چپ کیوں ہو جاتی ہے، بتاتی کیوں نہیں حیات کہاں جاتا ہے۔'' ساس نے بیٹے کے بے شکن بستر پر بیٹھتے ہوئے پھر پوچھا۔

''مجھے نہیں پتہ اماں، کبھی مجھے نہیں بتایا'' وہ نگاہ نیچی کر کے بول رہی تھی، اماں سمجھ گئی تھیں زرینہ جانتی ہے لیکن خاموش ہے۔ اس کے دل میں خلیج اور گہری ہو گئی۔

''کیسی بیوی لا کر بٹھا دی میرے خاندان میں جو ماں کو ماں سمجھتی ہی نہیں'' دھیرے سے بڑبڑاتی ہوئی وہ لیٹ گئی لیکن بیٹے کی فکر اسکے دل میں ہول اٹھاتی رہی۔ ''اسکو کیا فکر، ماں کا کلیجہ تھوڑی ہے حیات کے لئے اس کے پاس، اپنے جگر ٹکڑے تو اپنے پاس ہیں'' زرینہ کو گھر کے روزمرہ کاموں میں مصروف دیکھ کر حیات خان کی ماں نے غمگین ہو کر سوچا۔

حیات اسکا تیسرا بیٹا تھا، جس کے ساتھ جڑواں بیٹے، رحمت کا حادثہ میں پچھلے برس ہی انتقال ہوا تھا۔ ''کیسی خدمت گزار بہو ہے رحمت کی بیوی۔'' اس نے پھر کلس کر سوچا۔ اب کے اس کی نگاہ کتابوں کی الماری پر ٹک گئی، نہ جانے کون کون سی کتابیں جمع کر رکھی ہیں حیات خان نے..... پہلے تو ایسا کوئی شوق نہ تھا، اس کے ساتھ رہ کر عجیب عجیب سے انداز ہو گئے ہیں میرے بچے کے..... پڑھی ہوئی ہوتی تو دیکھتی پڑھ کر، کیا پڑھتا ہے جو ایسا ہو گیا ہے'' ماں کا دل اولاد کی فکر میں تھا۔ ''پڑھی ہوئی تو یہ زرینہ بھی نہیں ہے مگر کتابیں صاف ایسے کرتی ہے اور کھول کر ایسے بیٹھتی ہے جیسے بڑی عالمہ ہو۔''

ایک اور ناگواری کی لہر ابھری جسے ''السلام علیکم'' کی آوازوں نے دھیما کر دیا۔ دونوں پوتے شہروز اور بہروز گھر آ چکے تھے۔ اسکول کے بستے رکھتے ہی زرینہ نے انکو کپڑے تبدیل کرنے کا حکم دیا، جسے سنی ان سنی کر کے وہ ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ روٹی توے پر سینکتے اس نے باورچی خانہ سے دوبارہ بیٹوں کو یونیفارم بدل کر کچن کے باہر رکھے تخت پر آ جانے کو کہا مگر مجال ہے جو انکے کانوں پر جوں رینگی ہو، اب دونوں بھائیوں میں نوک جھونک شروع ہو چکی تھی۔ زرینہ کے چہرے پر ناگواری آ گئی لیکن اس نے مزید انکو کچھ کہنے کے بجائے روٹی کا کام پورا کرنے پر توجہ لگا دی۔

اتنے میں گیتی آرا بھی اسکول سے آ گئی، ماں نے گیتی کو دیکھ کر سکون کا سانس لیا کہ وہ وقت پر گھر پہنچ گئی۔ اس کے گھر آنے کے مقررہ وقت میں کچھ گھڑیوں کی تاخیر سے بھی زرینہ کو ہول آنے لگتے تھے حالانکہ اسکول گھر سے چند منٹ کے فاصلے پر تھا، وہ محلّہ کی لڑکیوں کے ساتھ ہی واپس آتی تھی۔ صبح زرینہ اسے خود ہی گیٹ تک چھوڑنے جاتی تھی۔ وہ زرینہ کی فکر پر کبھی جھنجھلا جاتی۔

''امی کچھ منٹ آگے پیچھے ہو ہی جاتے ہیں، ایسے کیوں پریشان ہو جاتی ہیں؟''

''گیتی تم حیات خان کی بیٹی ہو۔ دیبا، روبینہ اور ناہید کی طرح نہیں'' زرینہ بیٹی کے سوال پر اکثر کوئی جواب نہ دیتی، بس کبھی کبھار دھیمے سے یہ کہتی جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کر رہی ہو گیتی کو ماں کا یہ جواب کبھی سمجھ نہ آیا تھا۔

''اماں!'' وہ زرینہ کو لاڈ سے پکارتی تو اماں ہی کہتی تھی۔ آخری

روٹی توے پر ڈالتی زرینہ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ بدستور یونیفارم میں تھی۔ دلکشی اس پر چھا رہی تھی، سنہری عمر کی سنہری رنگت میں سپیدی جھلکنے لگی تھی۔ حیات خان کا آبائی اور نسلی رنگ وروپ گیتی آرا میں اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ زرینہ نے بے اختیار گھر کے دروازے کی جانب دیکھا جو بند تھا، لیکن صحن کی دیواریں اس کو ہمیشہ نیچی ہی لگتیں، آم کا درخت گھر کے باہر لگا تھا لیکن اسکی شاخیں چھتری کی مانند صحن میں سایہ سا کر دیتی تھیں۔ پتے خاصے جھڑتے تھے جنکا کوڑا سمیٹنے کیلئے بڑی مستعدی سے دن میں دوبار صفائی کرنی پڑتی تھی، جو ایک بار کرنا گیتی آرا کے ذمہ تھی۔ زرینہ کی نگاہیں دروازے اور صحن کا چکر لگاتی دوبارہ بیٹی پر لگ گئیں جو اب پتیلی کا ڈھکن کھول کر دیکھ رہی تھی۔ زرینہ نے اس کی کمر پر دھموکہ جڑتے اس کی سستی پر اسکو دو چار سخت جملے کہہ دیئے۔ گیتی آرا نے پلٹ کر بے یقینی سے ماں کو دیکھا جو نہ جانے کیوں اس کو ڈانٹ رہی تھی۔ وہ محض پانچ منٹ قبل ہی گھر میں داخل ہوئی تھی جبکہ دونوں بھائی اس سے پندرہ بیس منٹ پہلے پہنچ جاتے تھے۔ انکے اسکول میں دوسری شفٹ لگتی تھی تو اسکول کی چھٹی نسبتاً جلدی ہو جاتی تھی۔ وہ ابھی تک دونوں اسی طرح کھیل کود میں مصروف تھے۔ زرینہ نے سرزنش کی یہ کیفیت بیٹوں پر نہ ظاہر کی تھی، الٹا انکے ادھر اُدھر پھینکے موزے سمیٹ کر اکثر وہ خود ہی دھلنے ڈالتی تھی، یا پھر گیتی آرا کو ہدایت تھی کہ ان نواب زادوں کے کام سمیٹ دیا کرے۔

اپنا پسندیدہ کوفتہ آلو پکا دیکھ کر گیتی آرا کو جتنی خوشی ہوئی تھی، ماں کی ڈانٹ نے سب پر پانی پھیر دیا۔ وہ سست قدموں سے کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی، کالے سیاہ بالوں کی گھنی چوٹی اسکے سراپے کو پشت سے بھی نمایاں کر رہی تھی۔ بالوں کا رنگ اسکا کس قدر مختلف ہے اپنے خاندان سے! زرینہ نے بیٹی کا تجزیہ کیا۔ بظاہر وہ گیتی آرا کی آنکھیں پڑھ کر بھی خود کو اس کے احساسات سے بے نیاز ظاہر کر رہی تھی۔ کچھ سالوں قبل ہی حیات خان بیوی بچوں کو کراچی لایا تھا، اس سے پہلے وہ اپنے خاندان کو آبائی علاقے ہی میں چھوڑ کر کراچی میں پولیس کی نوکری کرتا تھا" اپنا آبائی ٹرانسپورٹ کا کام چھوڑ کر حیات خان یہ کیا تم ٹکے کی نوکری کرتے ہو؟" حیات خان کی ماں اور بھائی اکثر اپنی ناپسندیدگی اس پر ظاہر کرتے تو وہ مسکرا دیتا۔

"اماں یہ ملک بڑی نعمت ہے، بس کچھ ایسا کرنا چاہتا ہوں جو اس کا کچھ قرض اتار سکوں۔"

شہباز خان کی آنکھیں اور بھنویں بھائی کے جواب پر تن جاتیں۔ "اماں اس کی پیدائش سے پہلے کیا کھایا تھا جو یہ ایسا ہے، سب سے انوکھی باتیں کرتا ہے، ارے تمہارے ساتھ کا رحمت بھی ہے، اس نے بھی اتنا کما لیا ہے کاروبار سے کہ اپنے کھیت اور گھر دونوں علیحدہ کر لیے ہیں اور تم ابھی تک کچھ نہیں بنا سکے۔" شہباز کی زبان بولتی، باقی سب کی خاموش نظریں ہمنوا ہوتیں حیات خان کی پیشانی پر پورے دو بل پڑتے لیکن اس کی زبان دانتوں تلے ہی رہتی۔

"سیدھا سیدھا باقی بچوں کے ساتھ اسکول جاتا تو حواس صحیح رہتے۔ ناحق میں نے اسکو مولوی نذیر الدین کے مدرسہ میں ڈالا، سوچا تھا پانچ لڑکوں میں سے ایک حافظ قرآن بن جائے گا تو جنت ہمارے لیے بھی کھل جائے گی آسانی سے..... لیکن پتہ نہیں کیا گھول کر پلا دیا کہ کمانے دھانے کا کوئی خیال ہی نہیں۔"

حیات خان کی ماں گل بی بی کے لہجے میں فکر ہی فکر تھی۔ انکے دس کمروں کے ایک منزلہ گھر میں قرآن کے علاوہ دو چار کتابیں ہی تھیں، جن میں دو گل بی بی کے شوہر کی یادگار تھیں۔ نہ جانے کس موضوع پر تھیں، وہ نہ جانتی تھیں۔ دو ان کے بیٹوں کے اسکول پڑھنے کے وقت کی تھیں، وہ بھی کیا تھیں گل بی بی کو نہیں معلوم تھا۔ چاروں بیٹوں نے چند سال ہی اسکول پڑھا تھا پھر باپ کے ساتھ یکے بعد دیگرے کام لگتے گئے تھے۔ ان کا کام پشاور میں زیادہ تر تھا، سو ہر وقت کا آنا جانا لگا رہتا۔ باقی تین بیٹوں کے بچے چھوٹے تھے صبح سے سہ پہر تک گھر سے جڑے کھیتوں میں ہی کھیل کود کرتے رہتے۔ انکی مائیں بھی وہاں کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتیں۔ شہباز کی کوئی اولاد نہ تھی۔ بھائی کے بچوں سے ہی اس کا دل لگا رہتا تھا۔

ایک حیات خان تھا جسکے بڑے سے کمرے میں شیشم کی لکڑی کی

لمبی چوڑی الماری میں اتنی کتابیں تھیں کہ گل بی بی کو حیرت ہوئی کہ اتنا یہ کیسے پڑھ لیتا ہے۔''حیات آخران کاغذ کے گھڑوں میں ایسا کیا ہے جو تو نے اتنی حفاظت سے انہیں سنبھال رکھا ہے۔'' گل بی بی نے قرآن کو جزدان میں عقیدت سے لپیٹتے ہوئے ایک دن پوچھا تو ''دین کی سرحدیں اور ہمارے تصورات'' نامی کتاب کے صفحات پلٹتے حیات خان نے قریب کھڑی ماں کو دیکھا اور کتاب بند کردی۔کوئی حدیثؐ کی کتاب ہے کیا؟'' ماں نے پھر سوال کیا تو حیات خان کا جواب سننے کے لئے زرینہ بھی ٹھٹک گئی، اسے بھی حیات کا کتابوں سے اتنا شغف اپنے ماحول کے حساب سے بہت اجنبی لگتا تھا لیکن سرتاج تھا، اس کی ہر ادا اسے بھاتی تھی ۔ وہ تھا بھی بہت نرم خو اور نرم مزاج، گیتی آرا اور شہروز کو اس نے مولوی نذیر کے مدرسہ میں چار سال کی عمر سے بٹھا دیا تھا، بہروز ابھی چھوٹا تھا اپنے ہم عمر عم زاد کے ساتھ کھیل کود میں رہتا۔

گیتی آرا دس سال کی اور شہروز آٹھ سال کا ہو چکا تھا جب حیات خان نے سوات چھوڑ کر کراچی رہنے کا فیصلہ کیا۔اس کی نوکری کا حساب وہی تھا کہ گھر والوں اور خود اسکو علم نہ ہوتا تھا کہ کب بلاوا آجائے گا۔

''ایسی کیا پولیس کی نوکری ہے کہ چھٹیاں بھی ٹھیک سے نہیں ملتیں اور ویسے بھی یہ ٹکے ٹکے کی نوکری ہی کرنے کو رہ گیا ہے حیات خان؟''

گل بی بی کو حیات کے ایکدم چلے جانے پر پھر غصہ آنے لگا تھا۔

''ابھی تین ماہ بعد آئے ہو اور تین ہی دن ہوئے ہیں پھر جانے کی لگی ہے۔'' زرینہ بھی میاں کے جانے کا سن کر بجھ سی گئی ۔اس کے چہرے پر سرخیاں دوڑتی تھیں حیات خان کی موجودگی میں اور یہ ہی چہرہ پھیکا پڑ جاتا تھا جیسے ہی وہ گھر سے چلا جاتا۔

''نوکری نوکری ہوتی ہے بی بی جان ! ہمیں احکامات ماننے ہوتے ہیں۔''

''تو کون سی خاص نوکری کرتا ہے، تھانے میں تو ہوتا نہیں پھر کہاں ہوتا ہے؟''

گل بی بی کے سوال پر حیات خان نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھا، اس کو تعجب نہ تھا کہ بی بی جان کو سوات رہتے کراچی میں اس کے حالات کا علم کیسے ہوا، کراچی شہر میں انکے بہت سے قریبی رشتہ دار رہتے تھے۔

''ہوتی ہیں کچھ نوکریاں ایسی جن میں ایک جگہ بندہ نہیں ٹکتا، بس اسی لیے تھانے میں نہیں ہوتا۔''

ماں نے بیٹے کا جواب سن کر قرآن آگے بڑھایا''یہ الا بلا پڑھنے کے بجائے اللہ کی پاک کتاب پڑھا کر، اس کا حافظ جنت میں جائے گا اور ستر لوگوں کو بھی ساتھ لے کر جائے گا، اللہ بخشے آغا جان ہر وقت یہ ہی کہتے تھے۔''

گل بی بی نے اپنے باپ کا ذکر بہت عقیدت سے کیا تو حیات خان نے فوراً کتاب ہاتھ سے چھوڑ کر قرآن تھام لیا''بی بی جان قرآن فجر کے بعد میں نے پڑھ لیا تھا۔ جو میں پڑھ رہا ہوں وہ بھی قرآن ہی کا حکم ہے۔''

اس کو بہ خوبی علم تھا آغا جان کے باغات میں وسیع رقبہ پر پوست کے نازک پودے بھی لہلہاتے تھے جن کی آمدنی سے گھر میں خوشحالی کئی گنا بڑھ جاتی تھی ۔ وہ یہ ماں سے کہہ نہ سکتا تھا۔ اسکے اپنے ذہن پر سوچوں کی یلغار تھی سرحد پار سے شورشوں کو ہوا دی جارہی تھی، حیات کی نظریں اکثر نقشہ پر انگلیاں پھیرتیں اور چہرہ تن جاتا ، اسے ابکے پہاڑوں کو عبور کرنا تھا۔اس بار کا مشن اسکا زیادہ مشکل تھا۔اس نے اس مہم سے واپسی کے بعد کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔گھریلو اور تعلیمی دونوں پہلوؤں سے وہ اپنے آبائی ماحول سے ہٹ کر بچوں کی پرورش کرنا چاہتا تھا۔حالانکہ زرینہ جیسی سیدھی سادی گھریلو عورت کو محض بچوں کے ساتھ کراچی شہر میں رہنے کے لئے جن صلاحیتوں اور سوجھ بوجھ کی ضرورت تھی وہ فی الحال اس میں موجود نہ تھیں لیکن حیات خان نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی اس کمی کو پورا کرسکتی ہے اور اس کی غیر موجودگی میں گل بی بی زرینہ کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔باوجود اس کے کہ وہ جانتا تھا کہ زرینہ گل بی بی کی تاحال منظور نظر نہیں بنی۔وہ چاہتا تھا کہ وہی زرینہ کے ساتھ رہیں۔اس کی ماں بہت حوصلہ منداور آہنی اعصاب کی عورت تھی، شہر میں رہنے کے لئے وہ زرینہ کے ساتھ بہت موزوں

تھی ۔گل بی بی کو اس نے اپنے ارادوں کا بتایا تو حسب توقع اس کو اختلاف تھا۔

''اب تمہارے بچوں اور بیوی کی نگہبانی کے لئے مجھے اپنا دیس چھوڑنا ہوگا۔'' گل بی بی کی ناک کی ہیرے کی لونگ نے بھی جیسے رنگ بدلا۔''تم تو بنا بتائے کسی بھی وقت چلے جاتے ہو، میں اس عمر میں دھوبی گھاٹ کا جانور بنوں'' گل بی بی سخت اشتعال میں تھیں پہلے رحمت کے کراچی منتقل ہونے کی خبر نے انہیں فکر میں مبتلا کر دیا تھا اور پھر اس زرینہ کے ساتھ رہنے کی درخواست نے انکو فکر در فکر میں ڈال دیا تھا۔ دوسرا شہر، نئے طریقے نئے رواج اور پھر کراچی کی گیلی اور سیلی سی آب و ہوا میں سوات جیسی لطافت کہاں۔

پورے چھ ماہ گل بی بی نے کراچی میں رہنے کے لئے سامان تیار کرنے میں لگائے ۔حیات خان کی تنخواہ کا ڈارفٹ باقاعدگی سے اس کے ادارے سے آرہا تھا مگر آٹھ ماہ گزر چکے تھے اور اسکا خود کا کہیں اتہ پتہ نہ تھا۔زرینہ سرخ گلاب سے زرد گلاب میں تبدیل ہوگئی تھی۔گل بی بی کی انگلیاں مستقل تسبیح کے دانے گرانے میں مصروف رہتیں ۔دور افق کے پار سے نظر آتے پہاڑوں کے سروں پر زرینہ کو حیات خان کا سراپا گردش کرتا لگتا جو اس کو دیکھ کر باہیں پھیلاتا اور وہ ایک ٹک اسے دیکھے جاتی۔

اور پھر ایک شام جب برف کے سفید پھول زمین پر برسے تو حیات خان آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اچانک اور ہمیشہ کی طرح قندھاری انار سی رنگت سے جیسے رس نچڑ چکا ہو، گھر بھر میں ایسی حرارت دوڑی جیسے باہر برف کے بجائے آرام دہ اور نرم سی دھوپ پھیلی ہو۔زرینہ جیسے بیر بہوٹی ہی ہوگئی جب حیات خان نے اسکے آنچل کا کونہ پکڑ کر کھینچا، رعنائیاں جیسے اس پر یکدم برس پڑیں، بچے باپ کو دیکھ کر دور دور سے خوش ہو رہے تھے، حیات خان نے انکو لپٹا کر خوب پیار کیا اور گل بی بی نے علاقے کے ضرورتمند خاندانوں میں گوشت کا سالن بنوا کر تقسیم کیا۔

''یہ ایسی کیا نوکری کرتا ہے تو حیات خان، کہ تجھے دن وقت کا پتہ نہ جگہ کا، تو تو ہم سے ایسے کٹ جاتا ہے جیسے بندہ زمین سے کٹ جاتا ہے ہوائی جہاز میں'' گل بی بی پچھلے برس ہی چوتھا عمرہ کر کے آئی تھی، حج بھی کر چکی تھی سو اس نے کمال دانشمندی کی بات کہی اور حیات خان بے ساختہ مسکرا گیا۔

''بس بی بی کام ہی ایسا ہے یہ دعا کریں اللہ قبول بھی کر لے یہ سب تھکان'' حیات خان نے ہمیشہ کی طرح گول مول جواب دیا۔

''خفیہ کام کرتا ہے بی بی یہ.....اس سے نہ پوچھو'' فیروز خان کے جملے پر ماں نے چونک کر حیات کو دیکھا مگر اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا اور ماں کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند لیں ۔آنسو اس کی پلکوں پہ لرزنے لگے تھے۔اس کے جڑواں بھائی رحمت کی پہلی برسی کچھ دن قبل ہی تھی ۔رحمت خان کے ساتھ مل کر ہی اس نے پہاڑوں کو قدموں تلے روندنا سیکھا تھا۔بلندیاں سر کرنے کا فن رحمت کو خوب آتا تھا اور وہ حیات خان کے ساتھ علاقے کے بلند ترین پہاڑوں پر تفریح گاہ کی طرح جاتا۔ حیات خان کے مکمل کئے آخری مشن میں پہاڑوں کو زیر کرنے کا ہنر آنا بہت ضروری تھا۔اسے قدم قدم پر رحمت یاد آیا، ہر یاد پر اس نے بھائی کی مغفرت کی دل کی گہرائیوں سے دعا کی ۔استاد نذیر کہتے تھے جانے والے کے لئے، جب کہ وہ ہمارا پیارا ہو، دنیا میں ہم نے اس سے فیض پایا ہو، دعائے مغفرت حق ہے ۔وہ ہماری طرف سے آنے والے ان تحائف کا محتاج اور آرزومند ہوتا ہے۔حیات خان کے کانوں میں استاد کی بات پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکراتی گونجتی آتی تو وہ رحمت خان کا یہ حق ضرور ادا کر دیتا۔

فیروز خان نے بھائی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھا اور خاموشی سے اس کو کچھ دیا''یہ لو حیات لالہ تمہارے حصہ کا'' فیروز نے نوٹوں کی گڈی حیات کے آگے بڑھائی ۔حیات نے آنکھیں ذرا سی کھولیں۔''

''جب محنت میری نہیں تو منافع کیسے میرا فیروز'' اس کی آواز میں سوز تھا،لمحہ بھر پہلے کے خیالات کی پرچھائیاں تھیں۔

''لالہ بے شک کاروبار میں محنت تمہاری نہیں پر بنیادی پیسہ جو اس کاروبار میں ہے وہ ورثے میں ملا ہے، اسی حساب سے تم بھی شریک ہو ہر بار تم یہ پوچھتے ہو اور ہر بار میں تم کو یہ ہی بتاتا ہوں پچھلے برس بھی بتایا

تھا۔'' حیات نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ گنے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''فیروز خان کیا آئندہ دس سال کا ایک ساتھ دے دیا ہے؟'' وہ بہم سا مسکرایا۔

''نہ لالہ آئندہ دس سال کا نہیں بلکہ یہ تمہیں جو شہر میں جا کر رہنے کی سوچی ہے، اس کے لئے کچھ بندوبست کی کوشش ہے۔ کیا خیمے میں رہو گے اور بیوی بچوں کو اس میں رکھو گے؟''

حیات خان نے سب سے چھوٹے بھائی کو کتنی دیر تک گہری نظروں سے دیکھا اور پھر اسے گلے لگا کر بھینچ لیا۔ نہ حیات نے کوئی لفظ کہا اور نہ فیروز نے کوئی جملہ بولا۔ کچھ وقت خاموشی سے گزر گیا اور پھر فیروز خان اُٹھ کر چلا گیا۔ حیات کراچی منتقل ہو چکا تھا۔ گیتی آرا شہروز اور بیروز اسکول میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ شہر کے اس حصے میں تھا جہاں پاکستان بھر سے کراچی آئے لوگ اردگرد رہتے تھے۔ کچے مکان بھی تھے، پکے بھی اور خوشحالی کا نشان بھی۔

گل بی بی شروع میں کچھ عرصہ ساتھ رہی، حیات خان کا بھی کوئی بلاوا نہ آیا، وہ صبح جاتا اور شام واپس آ جاتا۔ زرینہ کو زندگی اتنی پرسکون کبھی نہ لگی جتنی کراچی شہر میں حیات خان کی موجودگی میں لگی۔ بس کتابیں تھیں جو اس کو کبھی کبھار اپنی سوکن لگتیں، حیات گھر آ کر بھی گھنٹوں انکے ساتھ گزارتا۔ زرینہ کو اپنا شوہر بڑا ہی مہان لگتا جب وہ رواں اردو اور انگریزی میں موبائل پر کسی سے باتیں کرتا۔ یہ رابطے اس کی نوکری سے ہی متعلق ہوتے لیکن وہ ایک ٹک شوہر کو دیکھتی اور داسی بن جاتی۔ حیات کا انتخاب بطور شریک حیات زرینہ بہت خوب رہا۔ وہ اسکے لئے ہر لحاظ سے نہ صرف شریک حیات بلکہ رفیق حیات بھی رہی، حیات خان پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے لئے طے شدہ راستے پر مصروف عمل رہا۔ وہ خفیہ ادارے کا پیامی تھا، جسے ادارہ اس کی خصوصی صلاحیتوں کے باعث اکثر سرحد پار بھیجتا رہتا تھا۔ پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لئے حیات خان جیسے بے شمار گمنام سپاہی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہر لحہ مصروف عمل رہتے ہیں نہ انکو ناموری ملتی ہے اور نہ تاجوری، نہ ستائش انکی نہ زیبائش کوئی خاص، وہ ایسی تجارت رب سے کرتے ہیں جس میں سراسر منافع ہی منافع ہے ہر آن۔ اسلامی سرحدوں کی حفاظت میں جاگتی آنکھ پر حدیث نبویؐ کے مطابق دوزخ کی آگ حرام ہے۔ مولوی نذیر کے مدرسہ میں کوئی حیات خان سے پوچھتا ''کیا سیکھا'' تو وہ بلاشبہ یہ ہی جواب دیتا بہت کچھ لیکن جو بات براہ زندہ رہتی وہ جاگتی آنکھ سرحد پر، اور اسکے ساتھ رب کی بشارت بندے پر!

حیات خان سال بھر مستقل شہر میں ہی رہا۔ گل بی بی اس دوران دوبارہ سوات ہو کر آ چکی تھی۔ زرینہ ہر دن سورج نکلنے سے پہلے دعا کرتی کہ حیات خان کے ساتھ اس کی زندگی ایسی ہی ہموار اور پرسکون گزرے، وہ اکٹھے رہیں، چاہے وہ کتابیں مزید پڑھتا رہے لیکن رہے ساتھ۔ اس کی روانگی ہر بار اسکو خوفزدہ کر دیا کرتی تھی، کہ جانے اب وہ اسکو پھر کبھی زندہ سلامت پائے گی بھی یا نہیں۔ حیات کے کام کا تقاضا تھا کہ مشن کی تفصیلات کسی کو ادنی درجے پر بھی نہیں بتائی جاتیں۔ بس وہ ہر بار ایک جملہ کہتا تھا۔

''مینا، میں ساحلوں سے نہیں چمٹا رہنا چاہتا، جو کام میرا ہے اس میں مجھے موت یا زندگی کی کوئی پروا نہیں۔ تمہارا ساتھ مجھے کمزور نہ کرے بلکہ سر بلند رکھے دونوں جہانوں میں۔''

زرینہ کے دل کی دھڑکنوں میں محبت اور فرمائش دونوں کی لہریں پوری قوت سے اچھال پیدا کرتیں اور وہ اس جذباتی اور کمزور کر دینے والے مرحلے سے عافیت سے گزر جاتی۔

کراچی آئے تین سال ہونے کو تھے۔ حیات خان بس دوسرے برس ہی اپنے خفیہ مشن پر آٹھ ماہ کے لئے آدھی رات کو کال ریسیو ہوتے ہی روانہ ہو گیا تھا۔ نہ جانے والے کو مشن پر روانگی کی حتمی تاریخ اور وقت بتایا جاتا تھا اور نہ وہ یہ راز اپنے سائے سے بھی ذکر کر سکتا تھا کہ وہ کس مشن پر ہے۔ زرینہ کو بس محض اتنا علم ہوتا تھا کہ وہ کس سمت جائے گا، باقی یہ کہ ملک کے اندر کی سرگرمی ہے یا باہر کی، عمومی ہے یا مزاحمتی، حملہ ہے یا دفاع یہ اسے کچھ نہ پتہ پڑتا۔ سمت بھی ہر بار حیات خان نہ بتاتا۔ گویا ایک بار دروازے سے رخصت کرتے ہی حیات خان اور اس کا دل دونوں ہی اس کو جدا ہوتے لگے۔ ''یا اللہ اس صورت کو واپس ہمارے

درمیان سلامتی سے بھیجنا''، بس اس جملہ کی گردان تھی جو دل کی ہر دھڑکن سے ابھرتی۔ محبت طلب کا سلیقہ سکھا ہی دیتی ہے۔ زرینہ بھی سیکھ گئی تھی۔

اور آٹھ ماہ بعد جب وہ واپس آیا تو بھی آدھی رات تھی۔

گل بی بی کا بستر اس رات بے شکن تھا اور زرینہ کے اشک اسکے تکیے کو بھگو چکے تھے۔ اچانک دستک ہوئی اور دروازہ کھلتے ہی حیات خان سامنے تھا گل بی بی نے لپک کر بیٹے کو گلے لگالیا نہ کوئی سوال نہ کوئی جواب۔ بس دعائیں مستجاب ہوگئی تھیں۔ حیات خان کی سلامتی سے گھر واپسی ہو چکی تھی۔ زرینہ کے لئے تو جیسے ہر جانب پھول کھل چکے تھے۔ اداسی کی وہ لہریں جو گردش میں تھیں، یک لخت غائب ہوگئی تھیں۔ ایک کیفیت سرشاری تھی جو اس پر چھا گئی۔ ''زندگی کس قدر حسین ہے'' اس نے اپنے کمرے میں حیات خان کو دیکھ کر بے اختیار سوچا اور ہنس پڑی۔ حیات خان نے مسکرا کر مخمور نگاہوں سے یہ ادائے دلربائی دیکھی، کھڑکی سے باہر رات کے آخری پہر روشن ہوتے آسمان پر ہجر کا کوئی تارہ اسے دکھائی نہ دیا۔ یہ وصل کے لمحات تھے۔

زرینہ کو دن اور رات گنگناتے لگنے لگے تھے۔ لاشعور میں حیات خان سے جدائی کا خیال آتے ہی وہ زرد گلاب سی بن جاتی۔

''کیا تم کوئی اور کام نہیں کر سکتے حیاتی، جس میں جان کے خطرات اور گھر سے غیر حاضری نہ ہو'' اس نے آمد کے تیسرے ہی دن اداس لہجے میں حیات خان سے پوچھا تو وہ بیٹے کی سائیکل کی چین ٹھیک کرتے ہنس پڑا۔ صحن میں آتی درخت کی شاخوں پر شام اترتی سائے بنا رہی تھی۔ ایک چڑیا بھی دلنشین آواز میں مستقل بول رہی تھی۔ زرینہ نے حیات خان کو ہنستا دیکھ کر برا ماننے کے انداز میں تیوریاں چڑھائیں اور قریب پڑا موڑھا کھینچ کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ گیتی آرا نے اپنی پڑوس کی سہیلیوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ماں کو دیکھا جو روٹھی روٹھی سی لگ رہی تھی، ابو پوری توجہ سے شہروز کی سائیکل کے ساتھ مصروف تھے۔ سب نے سلام کرتے صحن میں ہی رکھے تخت پر چوکڑیاں مار لیں۔ زرینہ کو انکی آمد بے وقت کی مداخلت لگی، اس نے آنکھ کے اشارے سے بیٹی کو اندر جانے کا کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں لڑکیوں کی ہنسی کی آوازیں کمرے سے باہر آنے لگیں۔ حیات خان کو گیتی آرا کی ہنسی ہمیشہ جلترنگ لگتی۔

''مینا، یہ ہماری گیتی کی آواز میں زیادہ حسن ہے یا اپنے علاقے کی دریا کی لہروں سے اٹھتی آوازوں میں'' اس نے کام کے انہماک کے درمیان اچانک سوال کیا تو زرینہ ہنس دی۔

''تمہاری موجودگی ہم سب میں حسن بھر دیتی ہے حیات خان۔''

''ہاں میں پندرہ دن اور رہوں۔ جس قدر حسین ہونا چاہو ہولو'' حیات خان کے جملہ نے زرینہ کو ساکت کر دیا۔

''تم پھر جا رہے ہو حیاتی'' زرینہ کی آواز میں آنسو ٹپک رہے تھے، وہ کچھ لمحوں بعد بولی تو حیات خان کے کام کرتے ہاتھ تھم گئے۔ اس نے فوراً ہی سائیکل کو چھوڑ کر ہاتھ جھاڑے اور قریب لگے واش بیسن کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اس کمزور لمحے سے مضبوطی سے گزرنا چاہتا تھا۔ سارا آسمان یکا یک بادلوں سے بھر گیا۔ مون سون کا موسم تھا، بارش نہ بھی ہوتی تو ابر ضرور اچانک چھا جاتا۔

''موسم پکوڑوں کا ہے، تم پکوڑوں کی تکلیف نہ کرو، ''دودھ پتی'' بنالاؤ بی بی جان کے کمرے میں پھر میں نے کچھ ورزشیں بھی کرنی ہیں سامنے میدان جا کر۔''

حیات خان گم سم اداس سی مینا کو بہلانا چاہ رہا تھا۔ زرینہ نے بنا تاثر کے اس کی بات سنی لیکن کچھ دیر بعد وہ بھاپ اڑاتی چائے کے مگ بنا لائی بی بی جان کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کر کے چائے پیتے وہ گاہے بہ گاہے زرینہ کو دیکھتا رہا، جو بالکل تھکی سی لگ رہی تھی۔ بی بی جان اور وہ ایک دوسرے سے بے نیاز، اپنی اپنی دنیا میں گم۔ گل بی بی باتیں کرتے ہوئے یکا یک چپ ہو جاتی اور حیات خان کا چہرہ تکنے لگتی۔

''حیات تیرا چہرہ پورا تیرے ابو کا سا ہوتا جا رہا ہے''

وہ بار بار یہ جملہ کہتی اور حیات خان کے تصور میں مدھم سا مٹا مٹا سا ہیولا مرحوم باپ کا آجاتا جس کا قتل کاروباری رقابتوں کی بنیاد پر اس کے لڑکپن میں ہو گیا تھا۔ باپ کے بعد خاندان کو سنبھالنے کی ساری ذمہ داری اس کے نانا ماموں نے اٹھائی تھی، اور کچھ ہی عرصہ میں حیات خان

کے دونوں بڑے بھائی یہ ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہو چکے تھے۔ کاروباری بھی اور گھر کی بھی۔ انہوں نے مرغی کی طرح اپنے پروں میں ماں اور چھوٹے بھائیوں کو سمیٹ لیا تھا۔

چائے ختم ہوتے ہی حیات خان نے جوتے کے تسمے کسے اور باہر نکل گیا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بعد جب وہ ڈپلی کیٹ چابی استعمال کر کے گھر میں داخل ہوا تو گھر میں خاموشی تھی بس گیتی آرا کی ماں سے دبی زبان میں بات کرنے کی آواز اسے اپنے کمرے سے آئی تو وہ کمرے کے باہر ذرا آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے کیوں۔

''اماں پتہ ہے دادی نے پھر کیا کہا جب ان کا فیتہ نہ ملا؟'' گیتی آرا کا لہجہ اسرار بھرا سا ہو گیا۔

''ہاں میری لاڈو کیا کہا دادی نے'' زرینہ کی آواز میں محبت ہی محبت تھی۔ یقیناً گیتی آرا ماں کی گود میں سر رکھے لیٹی ہو گی اور وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی اس سے باتیں کر رہی ہو گی۔ حیات خان نے بغیر دیکھے اندازہ لگایا۔

دادی نے کہا'' پیسہ میرے بیٹے کا، اور سارا کنٹرول بیوی کا، یہ تو مجھے ایک آنہ بھی نہ لینے دے، فیتہ کیا دے گی'' گیتی آرا نے پرجوش ہو کر بتایا۔

حیات خان نے بے اختیار کمرے میں جھانکا، زرینہ گیتی آرا کے درمیان ایکدم خاموشی چھا گئی تھی۔ دونوں کمرے کے اس حصے میں تھیں کہ ذرا کی ذرا جھانکنے سے نظر میں نہ آتیں، ایکدم ڈانٹ بھری آواز سے حیات خان چونکا۔ اس نے قدم تیزی سے اندر بڑھائے زرینہ کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ گیتی آرا گال پر ہاتھ رکھے سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ باپ پر نظر پڑنے کے باوجود اس کی کیفیت میں کوئی فرق نہ پڑا۔

''وہ ماں ہیں تمہارے باپ کی گیتی آرا'' اگر کچھ کہتی ہیں تو وہ کہہ سکتی ہیں، یہ انکی ہی دعائیں ہیں جو تمہارا باپ اور اس کا خاندان عافیت میں رہتا ہے تم انکی شکایت لگانا چاہ رہی ہو مجھ سے، ادھر کی بات اُدھر کرنے کا ہنر کس نے سکھایا تمہیں؟'' زرینہ کی آواز میں شعلوں کی سی لپک تھی۔ گیتی آرا کی کٹورا سی آنکھیں نمکین پانی سے لبریز تھیں۔

زرینہ کے جملوں نے حیات خان کے قدم سست کر دیئے تھے۔ یہ کیسے الفاظ تھے جن سے کمرہ گونج رہا تھا۔ ادب، عزت اور احترام کے وہ اسباق تھے جو ایک باشعور ماں اپنی نسل کو منتقل کر رہی تھی۔ تربیت کی ڈوری میں پہلی گرہ پڑتے ہی اسکو سلجھانے کا عمل کیا گیا تھا۔ اصلاح کرنے اور صحیح رخ متعین کرنے کی مضبوط کوشش ایک ماں نے اپنے طور بہتر انداز میں کی تھی۔ کونپل کے گرد خاردار باڑھ لگائی تھی تاکہ اس کی جڑیں زمین کی تہہ تک اترنے کا سلیقہ سیکھ لیں۔ معرکہ زیست میں وقار کے ساتھ، اخلاص کے ساتھ سرگرم عمل ہونے کی صلاحیت پالے رشتوں میں احترام نشتر جیسے الفاظ سے نہیں ابھرتا۔ تعلقات میں گل وگلزار کی سی کوئی تاثیر نہیں ابھرتی اگر اخلاق میں کانچ کے ریزے امنڈے چلے آئیں۔ اس نے بیٹی یا بیوی کو مخاطب کرنے کی بجائے کمرے سے واپسی کے لئے رخ کر لیا۔ اس کا رخ ماں کے کمرے کی جانب تھا۔ گل بی بی نہ جانے کون سی نماز پڑھ رہی تھی۔ حیات خان نے کمرے میں رکھی قد آدم الماری میں لگے آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھا۔

''حیات خان!'' وہ خود سے مخاطب ہوا''تم دو عورتوں کے ہمیشہ ہی مقروض رہو گے، چاہے وہ پہاڑ سر کرنا نہ جانتی ہوں وہ پھر بھی تم سے زیادہ جی دار رہیں گی، چاہے وہ موت سے پنجہ لڑانے کا کھیل نہ جانتی ہوں جو تم جانتے ہو، پھر بھی بلند حوصلے والی ہیں اور چاہے وہ دولت کے انبار نہ جمع کر سکتی ہوں وہ پھر بھی فیاض ہیں۔''

گل بی بی اور زرینہ کی شبیہہ رحمت خان کے دائیں بائیں جیسے ابھر آئی تھی۔ حیات خان آئینہ کے مزید قریب ہو گیا۔

''تم محبت کا وہ لامحدود خزانہ اپنی اولاد کے لئے بن ہی نہیں سکتے جو ایک عورت تمہاری ماں تم پر بے غرض سے لٹاتی ہے، جس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں رب سے اولاد کی سلامتی کی دعائیں بے حساب ہوتی ہیں، بنا کسی غرض اور ستائش کے۔ اس کی سانسوں سے تم وجود میں ڈھالے گئے تھے، وہ جان کنی سے گذری تو تم دنیا میں سانس لے سکے۔ ہر پل تم پر نچھاور کیا تو تم حیات خان بن سکے۔'' حیات خان کو جیسے کوئی

خیرخواہ سرگوشی کررہا تھا، یاددہانی کرارہا تھا۔

''کیا میں کچھ بھول چکا تھا، کیا کہیں مجھ سے کوتاہی ہو چلی تھی؟''

اس نے نادم ہوکر سوچا۔''انسان خطا کار ہے، کوئی انسان اس سے مبرا نہیں، شیطان انسان کی رگوں میں خون کے ساتھ دوڑتا ہے۔''

''نیک صفت بیوی دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ایک ہے۔''

زرمینہ کی خوشبو حیات خان کے آس پاس پھیل گئی۔حیات خان کو لگ رہا تھا وہ نوازے گئے انسانوں میں سے ہے۔اس کی تمام تر کامیابیاں اور کوششیں، چاہے اس جہاں کی چوٹیاں سر کرتے اس کے ساتھ چسپاں ہوں یا اُس جہاں کی، جہاں نور اور راحت کا عالم ہر سو چھایا ہوگا، وہ اس لئے کر سکا کیونکہ آغوش کی لوری سے لے کر بانہوں میں تسکین دینے تک اس کو رب نے نوازا تھا۔انعام کیا تھا، فضل فرمایا تھا۔

''حیات خان تم نے میدان مار لیا ہے''اس کے آخری مشن سے لوٹنے پر اسکے آفیسر نے حیات خان کو سلیوٹ مارتے یہ جملہ کہا تھا۔ حیات خان نے گردن موڑ کر ماں کی طرف دیکھا جو اب سلام پھیر کر ہاتھ پھیلائے تھی، رخ بدل کر کھلے دروازے کو دیکھا جہاں زرمینہ تھی جس کی آنکھوں کی چمک اور گالوں کی لالی ہمیشہ ہی حیات خان کو سکھ دیتی تھی۔

''میدان حیات خان نے نہیں حیات خان کے لئے اٹھتے ہاتھوں اور سکون پہنچاتے وجودوں نے مارا ہے۔''اس نے سرگوشی کی۔ پوری فضا ایکدم سے دھیمی سی خوشبو میں بس گئی تھی۔نیکی اور نیک خیالات اور تصورات زندگی کو ایک دوسرے کے لئے ایسے ہی سہل کر دیتے ہیں جیسے زرمینہ کے وجود نے حیات خان کے گھر روشنی کی طرح اتر کر اسکو ہلکا پھلکا رکھا تھا۔

وہ شاہین بن چکا تھا جو سرحدوں کی حفاظت کے لئے مستعد تھا اور اس کی پرواز اور بلند پرواز میں''ب''بی بی جان اور''ز''زرمینہ تھی یہ ایک مرد کی کتھا تھی جو''ب''کے نیچے نقطہ تھا اور''ز''کے اوپر!!

☆.....☆.....☆

صائمہ اسما

نیو یارک میں چند روز

نیو یارک کو دیکھ کر پہلا احساس یہ ہوا کہ ہمارے ہاں اس شہر کے جو سفرنامے لکھے جاتے ہیں وہ بین السطور دراصل ''چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط'' کی کرشمہ سازی ہوتی ہے۔ ورنہ خود شہر کے تو بس دو ہی تین نمایاں خدوخال ہیں۔ لیگو کے بلاکس کی طرح ساتھ ساتھ جڑی جدید وقدیم فلک بوس عمارتیں، ان کے بیچ ایک دوسرے کو مقرر حساب سے کاٹتی گلیاں، اور تقریباً ہر رنگ ونسل اور ملک وقوم کا باشندہ!

میں اوائل مارچ کے اتوار کی سہ پہر یہاں پہنچی تھی۔ یاسمین کا خیال تھا کہ نیو یارک کو پہلی بار رات کے وقت دیکھنا چاہیئے، دن اور رات کے نیو یارک میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور ہمارا حال وہ کہ ؎

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں!

سڑکیں خالی خالی تھیں۔ سورج کہیں اوپر ہی اوپر چمک رہا تھا، گلیوں میں تو دوپہر سے ہی شام اتری ہوئی تھی۔ کہیں کہیں کوئی روشنی کی چمکتی ہوئی لکیر جھلک دکھلا جاتی۔ کناروں پر اکٹھی کی ہوئی برف سے مسلسل پانی بہہ کر کیچڑ کر رہا تھا۔ کہیں کہیں سڑکیں ہم غریب ملکوں کی طرح ٹوٹی ہوئی بھی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے کوڑے کے بندھے ہوئے پیکٹوں کے ڈھیر تھے۔ سب عمارتیں مٹیالی اینٹوں اور سیمنٹ سے بنی ہوئیں، سو گرے رنگ کے علاوہ کوئی رنگ دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ اس پر مستزاد موسم آج کل ایسا کہ نہ پت جھڑ نہ بہار، نہ برسات۔ مجال ہے جو کوئی سبز پتہ بلکہ پتہ ہی کہیں نظر آجائے۔ پورے شہر اور اس کے راستے میں کوئی ایسا درخت وافر لگا ہوا ہے جس کی شاخیں اس موسم میں بالکل برہنہ ہو جاتی ہیں۔ سنٹرل پارک کو دیکھنے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اس کے باہر سے گزرے تو اندر خشکی اور ویرانی چھائی ہوئی لگی جیسے کوئی قبرستان ہو۔ بلکہ ہمارے ہاں تو قبرستان بھی سرسبز اور سایہ دار ہوتے ہیں۔

پھر چند روز بعد اس شہر کے مزید جوہر آپ پر کھلتے ہیں۔ سڑکوں پر گھومیں، سب وے میں سفر کریں، ہر جگہ شہر کا نظام دیکھ کر لگتا ہے کہ اس شہر کی باگ ڈور کچھ پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنہیں مسائل کو حل کرنا آتا ہے اور وہ اپنے عوام کی بھلائی کے لیے فکرمند بھی ہیں۔ یعنی جن کے پاس صلاحیت بھی ہے اور اخلاص بھی۔ جیسا کہ قرآن میں حضرت موسیٰؑ کے قصے میں قوی الامین کا معیار دیا گیا ہے یا سورہ یوسف میں حفیظٌ علیم کے الفاظ آئے ہیں۔ باقی رہے وسائل تو وہ ان دونوں خصوصیات کے نتیجے میں خود بخود آجاتے ہیں۔ پھر قدم قدم پر یہاں آکر یہ اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ میں محض انسان ہونے کی بنا پر قابلِ قدر ہوں، کوئی اور حوالہ اضافی ہے۔ انسانی شرف کی قدر کو اپنے نظام کی رگ وپے میں اتار دینا یقیناً اہلِ مغرب کا بڑا کارنامہ ہے۔

سرخ بتی کے ساتھ ہی پہیوں والی ٹریفک رک جاتی اور پاؤں والی ٹریفک چل پڑتی۔ مصروف شاہراہوں اور سیاحتی مقامات پر تو یہ پیدل ٹریفک اتنی حاوی ہے کہ گاڑیوں والے دوسرے درجے کے شہری نظر آتے ہیں۔ ایک تو ہر بلاک کے بعد سرخ بتی، اوپر سے حدِ رفتار اتنی کم کہ گاڑی میں بیٹھ کر ہم پاکستانیوں کو تو وحشت ہونے لگے۔ وقت کے پابند یہ لوگ ہوں گے، ہم تو حدودِ وقت سے آگے نکلنے والے لوگ ہیں! سڑکیں زیادہ چوڑی نہیں ہیں مگر چونکہ تجاوزات کا کوئی سوال نہیں اس لیے دونوں طرح کی ٹریفک بڑی سہولت سے رواں دواں رہتی ہے۔

صاحب کی نصیحتیں تو بس دو ہی تھیں۔ کسینو جاؤ تو لمبی رقم نہ لگانا کہ کنگال ہو جاؤ، اور پب میں گھسو تو اتنی نہ چڑھانا کہ گھر کا رستہ بھول

جاؤ۔ یہ اور بات کہ شام کو ٹھکانے پر پہنچ کر فون کرنے میں چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو گویا بھونچال سا آ جاتا۔ بے خودی و ہشیاری کا یہ امتزاج اور تغافل میں جرأت آزمائی کی یہ ادا...... کیا کہنے! مغرب کی عورت تعلق کی ان ڈوروں سے آزاد ہے یا محروم...... یا کتنی آزاد ہے اور کتنی محروم...... یہ فیصلہ کون کرے گا؟ اور یہ فیصلہ کیے بغیر اس کے نقشِ قدم پر چلنا ہمیں کس قدر راس آئے گا؟ میں یہی جاننے کے لیے یہاں آئی تھی۔

بیجنگ پلس ٹوئنٹی

میں یہاں یو این کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچی تھی۔ کوئی دو ہفتے قبل راحیل بہن کا فون آیا کہ بیجنگ پلس ٹوئنٹی کانفرنس ہو رہی ہے تم بھی چلو۔ ہم ہنس دیے ہم چپ رہے، کہ بھلا دو ہفتے میں کیا ممکن ہو سکتا ہے۔ اور ہو بھی جائے تو وہاں جا کر رہنے کا انتظام...... آنے جانے کا بندوبست؟ جواب ملا، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا...... کانفرنس کا پاس کہاں سے ملے گا؟ کچھ کر لیں گے...... بس تم چلو، بہت فائدہ ہوگا، میں بتا رہی ہوں ناں! راحیل کی اس بات پر تو ہمیں تبلیغی بھائی یاد آ جاتے تھے 'ان شاء اللہ بہت نفع ہوگا' ہم اس نفع کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھے اور اتنے شاندار انداز میں بنے ہوئے پروگرام کی بنیاد پر گھر والوں سے اجازت لینے سے بھی گریزاں...... کہ کیا بات کریں جب کہ ٹکٹ اپنے پلّے سے بھرنا ہے اور باقی سب کچھ اللہ پر چھوڑ رکھا ہے۔ سات سمندر پار کا سفر اور ایسی بے نیازی!! بہر حال اگر اللہ کو منظور ہو تو راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔

کمیشن آن سٹیٹس آف ویمن (CSW) اقوام متحدہ کی اکنامک اینڈ سوشل کونسل (ECOSOC) کا ایک فعال کمیشن ہے جو ۱۹۴۶ سے قائم ہے۔ اسی کمیشن کے تحت یہ کانفرنس ہو رہی تھی، جو گزشتہ بیس برس سے ہر پانچ سال بعد باقاعدگی سے منعقد ہوتی ہے۔ اس میں ۱۹۹۵ میں طے پانے والے بیجنگ اعلامیہ اور لائحہ عمل پر عملدرآمد کی پیشرفت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یو این کا ایجنڈا برائے نسواں بہت طول طویل ہے، مگر مذکورہ پروگرام میں اسے بارہ نکات میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ پیش رفت دیکھنا ممکن ہو سکے۔

ماحول بدل گیا ہے، تربیت کے انداز بدل گئے ہیں مگر آج بھی ہمارے ہاں جب بیٹی پیدا ہوتی ہے تو سب اس کو اچھی قسمت کی دعا دیتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ بزرگ جب یہ دعا دیتے تھے تو ہمارے برصغیر کی ساری روایت اور ہمارے ہاں ''سٹیٹس آف ویمن'' سے متعلق تمام طرزِ فکر و عمل، سارا مائنڈ سیٹ اس دعا میں سمٹ آتا تھا۔ اب جدید تعلیم اور بیرونی اثرات کی بنا پر بچیوں اور لڑکیوں کے لیے بہت کچھ بدل گیا ہے۔ مائیں خوش ہیں کہ جس روایتی سیٹ اپ میں ہم نے زندگی بتا دی اب ہماری بچیاں اس سے آزاد ہیں۔ اب انہیں قسمت کی دعا دینے کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی قسمت خود بنا سکتی ہیں۔ مگر یہاں آ کر احساس ہوا کہ اس دعا کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے، صرف اس کا محل بدل گیا ہے، کیونکہ اب ہماری بچیوں سمیت دنیا بھر کی بچیوں کی قسمت ان فورمز پر لکھی جا رہی ہے۔ اور ہم جیسے ممالک یہاں اتنے ہی بے بس ہیں جتنے ہمارے ہاں کے شرفا بیٹیوں کے سسرال کے بارے میں ہوا کرتے ہیں!!

اعزاز بھائی اور یاسمین مڈل ٹاؤن سے آ کر مجھے ندا کے اپارٹمنٹ میں سیٹل کر گئے۔ ندا کولمبیا یونیورسٹی میں فل برائٹر ہے اور اس کا اپارٹمنٹ یونیورسٹی کا حصہ ہے جس میں اس کے سمیت سات طالبات رہتی ہیں۔ مشترک کچن اور باتھ روم کے ساتھ سب بنیادی سہولیات سے مزین یہ صاف ستھری اور محفوظ جگہ مجھے بہت راس آئی اور ندا کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ ٹرین لینے کے لیے مجھے یہاں سے کوئی پون کلومیٹر چلنا پڑتا تھا مگر کئی وجوہات کی بنا پر یہ بس اور ٹیکسی لینے کی نسبت کہیں بہتر تھا۔ ندا نے میرے لیے جیکسن ہائٹس سے شاپنگ کر رکھی تھی، اپنا بستر میرے حوالے کر کے خود وہ اچھی بچی میٹرس نشین ہو گئی۔ بجلی گیس کے بغیر ٹھنڈے یخ گھروں میں رہنے والوں سے ہیٹنگ سسٹم کہاں برداشت ہوتا! دم گھٹنے لگا تو میں نے کمرے کا سسٹم بند کر کے کھڑکی کی درز ذرا سی کھول دی اور ندا سے کہا کہ سویٹر پہن لو، خدانخواستہ ٹھنڈ لگ گئی تو تمہاری اماں کیا کہیں گی!!

یواین ہیڈکوارٹرز فرسٹ ایونیو

کانفرنس یواین کے مرکزی دفتر میں تھی۔ یہ اقوام متحدہ کی سب سے بڑی اور مرکزی عمارت ہے جس میں اس عالمی تنظیم کا صدر دفتر قائم ہے، اس کے بعد جنیوا میں قائم دفتر کا نمبر آتا ہے۔ یہ عمارت نیویارک کے پہلے سرے شاہراہِ اول یعنی فرسٹ ایونیو پر بالکل دریائے مشرق کے کنارے واقع ہے۔ ۱۹۵۲ میں مکمل ہونے والی یہ انتالیس منزلہ خوبصورت اور انتہائی وسیع وعریض عمارت گلی نمبر بیالیس سے لے کر اڑتالیس تک پھیلی ہوئی ہے اور چوڑائی میں فرسٹ ایونیو سے لے کر دریا کے کنارے تک یوں پہنچتی ہے کہ اندر ایگزیکٹو لاؤنج میں بیٹھ کر دریا اپنے قدموں میں ٹھاٹھیں مارتا ہؤا محسوس ہوتا ہے۔ جنرل اسمبلی بلڈنگ، سیکریٹیریٹ اور ڈاگ ہامر شھولڈ لائبریری پر مشتمل یہ احاطہ پورا دیکھنے کے لیے کئی دن چاہئیں۔

پروگرام تین طرح کے تھے۔ کانفرنس میٹنگ سیشن جن میں ملکوں کے سرکاری مندوب شرکت کرتے، این جی اوز اور سول سوسائٹی ممبران کو لابیز میں بیٹھ کر کارروائی دیکھنے اور سننے کا موقع ملتا بلکہ بعض اوقات ان کو تجاویز اور تبصروں کی بھی دعوت دی جاتی۔ سائڈ ایونٹ جن میں مختلف ممالک اور بین الاقوامی این جی اوز نے جو ECOSOC مشاورتی سٹیٹس رکھتی ہیں، مختلف موضوعات پر ڈسکشن فورم کا اہتمام کیا ہوتا۔ یہ دونوعیت کے سیشن یواین بلڈنگ میں ہوتے، جبکہ تیسری قسم متوازی ایونٹس کی تھی جن کے لیے یواین کے بالمقابل چرچ سنٹر اور چند اور عمارتیں مخصوص کی گئی تھیں۔ ان کا دائرہ قدرے بڑا اور انداز عوامی تھا، اگرچہ موضوعات کی مطابقت کانفرنس کے ایجنڈے سے برقرار رکھی جاتی۔

اجنبی شہر کے اجنبی راستے

نووارد شخص کو نیویارک میں دو قدم چلنے کے لیے بھی موٹی سی سمت نمائی سیکھنی پڑتی ہے۔ محتاط لوگ نقشہ دیکھ کر جان لیتے ہیں۔ مجھ جیسے مہم جُو نقشے کو سامان میں سنبھال کر رکھ لیتے ہیں اور غلطیاں کر کر کے سیکھتے ہیں۔ پہلی بات تو بالائی وزیریں شہر کی ہے۔ دوسرے دن جب خود سے رختِ سفر باندھا تو ریڈ وَن پر اعتماد سے سوار ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد غور کیا تو کیا دیکھتی ہوں کہ زیرِ زمین سفر کرتی ہوئی ٹرین زمین کے پاتالوں سے نکل کر کھلے آسمان تلے مست خراماں ہے۔ اب کسی پُل پر سے گزر رہی ہے اور دونوں طرف وہی عمارتوں کا جنگل۔ ذہن پر بہت زور دیا کہ کل راستے میں کوئی ایسا منظر آیا ہو۔ اگلے سٹیشن پر غور کیا تو سٹریٹ نمبر کم ہونے کی بجائے خاصا بڑھ گیا تھا۔ یعنی میں ڈاؤن ٹاؤن کی بجائے اپ ٹاؤن والی ریڈ وَن میں سوار ہوگئی تھی۔ گویا۔

جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستا کوئی اور ہے!

دوسرا تجربہ مشرق ومغرب کا ہؤا۔ گلی نمبر پینسٹھ ایسٹ پر واقع پاکستان مشن پہنچنا تھا جہاں ڈاکٹر ملیحہ لودھی سے ملاقات طے تھی۔ میں اپنے اندازے سے گلی پینسٹھ کے قریبی اسٹیشن پر اتر گئی۔ باہر نکل کر اندازہ ہؤا کہ یہ ۶۵ ویسٹ ہے جو آگے سنٹرل پارک پر ختم ہو رہی ہے، بیچ میں سنٹرل پارک کا سمندر حائل ہے اور اس کے بعد ساحلِ مراد یعنی ۶۵ ایسٹ آئے گا۔ چارونا چار ٹیکسی لی۔ اس دن سینٹ پیٹرک ڈے کی پریڈ ہو رہی تھی اور جیسے ہمارے ہاں روٹ لگا ہؤا ہوتا ہے، اُس طرح جگہ جگہ راستے بند تھے۔ گھوم گھام کر ایک گھنٹے کی تاخیر سے پہنچی تو لگا کہ ایک گلی کے مشرق سے مغرب تک کا فاصلہ گویا مشرق ومغرب کا فاصلہ تھا جو طے کیا۔ یہ دو تجربے اتنا کچھ سکھا گئے کہ باقی دن دقت نہ ہوئی۔

توجہ سے رستہ چلوں تو آدھ گھنٹے کی واک اور آدھ گھنٹے کے ٹرین کے سفر کے بعد میں شام کو اچھے وقت واپس اپارٹمنٹ پہنچ جاتی تھی۔ کولمبیا یونیورسٹی سٹریٹ ۱۱۶ کے دونوں طرف واقع ہے۔ ایک گیٹ بروڈوے پر کھلتا ہے اور دوسرا ایمسٹرڈیم ایونیو پر۔ دونوں گیٹ کھلے رہتے ہیں تاکہ سٹریٹ پیدل عوامی آمدورفت کے لیے استعمال ہو سکے۔ گیٹوں پر معمول کی سیکیورٹی ہے بلکہ کبھی کبھار وہ بھی نظر نہ آتی تھی۔ کوئی جامہ تلاشی نہیں، کوئی پوچھ گچھ نہیں۔ نہ کوئی ایسی مشکوک نظروں سے آپ کے سراپے کا جائزہ لیتا ہے کہ آپ کو اپنے وجود پر خودکش جیکٹ بندھی محسوس ہونے لگے، نہ کوئی بہشتی دروازے نما چوکھٹوں سے آپ کو گزار کر بے داغ کردار کا سرٹیفکیٹ دیتا ہے، نہ آپ کے کاغذات نکلوا کر آپ کا شجرہ نسب کھنگالا جاتا ہے۔ میں اگرچہ اپنے سب ضروری

کاغذات ہر وقت ساتھ رکھتی تھی مگر پورے قیام کے دوران ایک جگہ بھی خود کو ثابت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

یادش بخیر! کبھی ہمارا ملک بھی ایسا ہوتا تھا۔ نو گیارہ ہؤا تو نیو یارک میں اور بھگتا ہم نے۔ اب جگہ جگہ سیکیورٹی کے ناکوں میں غریب عوام تو پھنس جاتے ہیں اور اونٹ آرام سے نکل جاتے ہیں!!

پینڈو کہیں کے!

پہلے دن چرچ سنٹر میں ایک ایونٹ بے حد دلچسپ رہا۔ موضوع تھا اشتہارات میں صنفی نمائندگی۔ حاضرین میں مندوبین کے علاوہ مقامی خواتین اور طالبات کی بھی بڑی تعداد شامل تھی۔

آغاز میں چند نمونے کے اشتہارات سکرین پر چلائے گئے۔ اگرچہ عورتوں کے میڈیا میں کمرشل استعمال کے خلاف کوئی نکتہ یو این کے اس پورے پروگرام میں شامل نہیں ہے، مگر اس ایونٹ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں عورت کو سیکس سمبل بنا کر مصنوعات فروخت کرنے والے اشتہارات کو ''بُرے اشتہارات'' کی مثال کے طور پر دکھایا گیا۔ یہ اور بات کہ مجموعی طور پر میڈیا کے کردار کو سراہنے والا انداز رہا کیونکہ تمام معزز پینلسٹ اپنے اپنے شعبے کے باعث میڈیا پر تنقید نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً ووگ میگزین کی صحافی شکتی، پراکٹر اینڈ گیمبل گورگرل برینڈ کی افزائش حسن کی مصنوعات مشتہر کرنے کی ذمہ دار سیما پٹیل، ایڈورٹائزنگ ایجنسی BBDO کا CEO جون اوسبورن، کاسموپولیٹن میگزین کی ایڈیٹر لیزلی، ایڈورٹائزنگ ایجنسی لیو برنیٹ کی سی ای او جوڈی، مورفیئس میڈیا کی مالک شینن ریڈ، خود میزبان وارین ہوگ نیویارک ٹائمز کے سابق ایڈیٹر تھے۔

منتظمین کا تو جو بھی خیال تھا، البتہ حاضرین شاید کسی اور خیال سے یہاں جمع ہوئے تھے۔ بھارت سے آئی ہوئی ایک لکھاری خاتون ڈاکٹر منجو کاک نے بڑی دردمندی سے میڈیا کے اثرات سے نوجوانوں کو محفوظ رکھنے میں بے بسی کا ذکر کیا۔ کہنے لگیں میرے پوتے سٹیفرڈ میں پڑھتے ہیں اور ان کو دیکھ کر میں آہیں بھرتی ہوں کہ ان کو اس ماحول کی خرابیوں سے کیسے بچاؤں۔ ان کے لہجے کی دلسوزی نے ہال میں موجود سب لوگوں کو بے حد متاثر کیا اور ہال بے اختیار تالیوں سے گونج اٹھا۔ حاضرین کے ریسپانس سے لگتا ہی نہ تھا کہ ہم نیویارک میں ہیں۔ پراعتماد، تجربہ کار پینلسٹ بھی چند لمحوں کے لیے مجوب سے ہو گئے۔ ہال میں ایک عورت بآوازِ بلند مصنوعی خفگی سے بولی، آپ کو کس عقلمند نے مشورہ دیا تھا کہ اپنے پوتوں کو سٹیفرڈ بھیجیں۔ اس پر سب ہنس پڑے۔

ایک گوری خاتون کہنے لگی کہ آپ جو سکرین پر عورتوں کو نو، نو انچ کی ہیل پہنے دکھاتے ہیں، کیا یہ نمونہ ہر عورت کے لیے قابلِ عمل ہے؟ حاضرین کی طرف سے اس سوال کو بھی پذیرائی ملی۔ شینن نے جواب دیا، میں تو اتنی ہیل سنبھال سکتی ہوں، جو نہیں سنبھال سکتیں وہ نہ پہنیں۔ اس پر ہمیں اپنے جنرل مشرف صاحب کے ایک وزیر با تدبیر کا بیان یاد آ گیا، جب میڈیا کی بے لگامی کی شکایت پر انہوں نے فرمایا تھا کہ جنہیں ٹی وی پروگرام نامناسب لگتے ہیں وہ ٹی وی نہ دیکھیں۔ نجانے شینن کو امریکی عورتوں اور نوجوان لڑکیوں میں Anorexia اور Bulimia کا انتہائی خوفناک حد تک بڑھتا ہؤا رجحان کیوں نظر نہ آیا، جو سکرین پر پیش کی جانے والی ماڈلز کی طرح نظر آنے کے خبط کا نتیجہ ہے۔ نمونے اسی لیے ہوتے ہیں کہ ان کی پیروی کی جائے۔

پروگرام ختم ہونے پر ہم نے وارین صاحب سے کہا کہ آپ کو پینل میں صارفین اور میڈیا یعنی Audience کو بھی نمائندگی دینی چاہیئے تھی تا کہ آپ ہی کی زبان میں ۳۶۰ درجے کا جائزہ ممکن ہوتا۔

پرچم ستارہ و ہلال

دوسرے دن گرینڈ سنٹرل سٹیشن کی عجیب و غریب دنیا سے باہر نمودار ہو کر میں نے معمول کی تقریباً ایک کلومیٹر پیدل واک ختم کی، اور جب فورٹی سیکنڈ سٹریٹ سے فرسٹ ایونیو پر قدم رکھا تو بے حد خوشگوار منظر دیکھا۔ یو این بلڈنگ کے باہر قطار سے لگے آہنی پول جو کل تک خالی تھے، آج ان پر ممبر ملکوں کے رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے تھے اور میرے بالکل سامنے چاند ستارے والا سبز پرچم تھا جس کی شان ہی نرالی تھی..... یہاں سایہ دار گلیاں ختم ہو کر دریا کا کنارا آ جاتا ہے اور منظر دور تک کھل جاتا ہے۔ نیلے آسمان کے پس منظر پر چمکتی دھوپ اور تیز ہوا

میں اڑتا ہؤا پرچم ستارہ و ہلال۔ مجھے لگا آج تو میں ہال کے اندر جا ہی نہ پاؤں گی، اسی کو دیکھتی اور تصویریں بناتی رہوں گی!!

اماں اور کمپیوٹر

دنیا میں انفرمیشن کمیونیکیشن ٹیکنالوجی کی صنفی بنیادوں پر تقسیم کو ختم کرنا بیجنگ لائحہِ عمل کے بارہ نکات میں شامل ہے۔ترکی کی ایک بین الاقوامی تنظیم نے اپنے سائڈ ایونٹ میں عورتوں کی معاشی خودمختاری کو موضوعِ بحث بنایا تو اس نکتے کا بھی تذکرہ ہؤا کہ عورتیں نئی ٹیکنالوجی کے استعمال میں دنیا بھر میں مردوں سے پیچھے ہیں اور اس کا اثر ان کی معاشی ترقی پر پڑ رہا ہے۔یو این کی ایک سابق عہدیدار مس وولف نے اس پر کچھ اعداد و شمار بھی پیش کیے۔

بات چیت کا آغاز ہؤا تو میں نے عرض کی کہ جناب، ترقی یافتہ خصوصاً مغربی دنیا میں تو آپ اس تقسیم کو ختم کیجیے، سر آنکھوں پر۔وہاں اس نوعیت کے امتیاز کا کوئی جواز نہیں۔عورتیں کیوں پیچھے رہیں جب کہ وہ ہر میدان میں موجود ہیں اور قوانین بھی پوری برابری کی حمایت کرتے ہیں۔خاندان کا پٹاوہ پہلے ہی گلے سے اتار چکی ہیں۔رسوم و رواج کے نام پر کوئی چیز ان کی راہ میں حائل نہیں۔ٹین ایج کی بچی گھر کو خیر باد کہہ کر خود اپنی زندگی بنانے نکل پڑتی ہے۔وہاں تو اس نوعیت کے صنفی امتیاز کیا، کسی نوعیت کے امتیاز کا تصور بھی شرمناک ہے۔البتہ جب آپ مشرقی، خصوصاً مسلم معاشروں کی بات کرتے ہیں تو آپ اس مسئلے کو صنف کی عینک لگا کر نہیں دیکھ سکتے۔مثلاً پاکستان جیسا معاشرہ جہاں اکثریتی گھرانوں میں گھر کے خرچ کا ذمہ دار مرد ہوتا ہے وہاں ٹیکنالوجی کے استعمال کی ترجیح بھی عموماً مرد ہی کی ہوتی ہے۔یہاں آ کر خالصتاً یہ ضرورت پر مبنی معاملہ بن جاتا ہے اور ضرورت ہی اس کی صورت گری کرتی ہے۔مثال کے طور پر وہی خانہ دار عورت جس نے شاید موبائل سے بڑھ کر کبھی ٹیکنالوجی کو استعمال نہیں کیا، ادھیڑ عمر میں اس وقت پہلی بار کمپیوٹر کا استعمال سیکھتی ہے جب اسے تعلیم یا روزگار کے لیے پردیس گئے اپنے بچے سے بات کرنی ہوتی ہے۔اس کی مامتا اسے اس عمر میں بھی نیٹ کی اجنبی دنیا کے رموز سے آشنا کر دیتی ہے۔لہٰذا اس معاملے کی تشریح حق کی بجائے ضرورت کی بنیاد پر کی جائے تو زیادہ حقیقی صورتحال سامنے آئے گی۔یہ ضروری ہے کہ ان مسائل پر بے روح اعداد و شمار اکٹھے کر کے بلا امتیاز تجزیے پیش کرنے کی بجائے ہم ان کو اپنے اپنے معاشرتی حقائق کے تناظر میں دیکھیں۔

بات مس وولف کے پلّے پڑی یا نہیں مگر ہال میں موجود دو سو افراد تک ضرور پہنچ گئی۔

سیکنڈ فلور، کھڑکیاں اور نظارے

ان ترقی یافتہ کافر قوموں کو چونکہ سچ بولنے کی بیماری ہے، اس لیے ان کی بنائی ہوئی مشینیں بھی، لاکھ مومنوں کے ہاتھ لگ جائیں، سچ ہی بولتی ہیں۔ہم جب بھی اپنی گود کے مکین کو جگاتے ہیں تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے حرفوں کی زبانی پہلی بات یہ کرتا ہے کہ آپ کی ونڈوز اصلی نہیں ہے۔اور ہم جل کر رہ جاتے ہیں کہ ''دل دیا بھیڑ یا کیوں مارنا ایں طعنے وے'' اور ذرا یہ بھی بتاؤ کہ پاکستان میں کس کی ونڈوز اصلی ہے؟ ہماری تو کھڑکیاں بھی مانگے کی اور نظریں بھی مستعار.....ہم نظارے کیا دیکھیں!! اور کیا ہماری عقل میں فتور ہے کہ جو چیز مفت میں دستیاب ہو، اسے خرید کر استعمال کریں؟ مگر مجال ہے جو وہ اس کے بغیر اگلی بات کرے۔ہماری گود میں بیٹھ کر بھی اس کا لہجہ آقاؤں جیسا رہتا ہے۔

اب امریکہ کا سفر اختیار کرتے ہوئے اس بات کی پریشانی تھی کہ سنا تھا ایرپورٹ پہ ونڈوز کا اصلی ہونا چیک کرتے ہیں ورنہ لیپ ٹاپ نہیں لے جانے دیتے۔بہرحال پاکستانیوں کو سب طریقے آتے ہیں۔وہ ٹیکنالوجی بناتے ہیں اور ہم اس کا توڑ کرتے ہیں۔

دوسرے دن سیشن میں وقفے کے دوران ہم گھومتے گھامتے سیکنڈ فلور پر جا پہنچے۔یہ ڈیلی گیٹس فلور کہلاتا تھا اور یہاں ملکوں کے سرکاری نمائندے اور حکومتی وفود کے لوگ گھومتے پھرتے اور آنیاں جانیاں دکھاتے تھے۔کہیں استعمال ہوتے اور کہیں استعمال کرتے.....شطرنج کی بساط پر اپنی اپنی چال چلنے کی فکر میں رہتے.....یا بس بے فکر رہتے کہ.....ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

لاؤنج میں خوب گہما گہمی تھی۔بھاپ اڑاتی چائے اور کافی کی پیالیوں پر کرہِ ارض کی تقدیر لکھی جا رہی تھی۔بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بنتِ

حوا کی تقدیر لکھی جارہی تھی۔جس طرف دیوار گیر شیشوں میں سے دریائے مشرق کے اس پار روز ویلٹ آئی لینڈ کی افقی لکیر نظر آتی تھی وہیں ایک طرف قطار سے انفرادی کمپیوٹروں کے کیوبکل بنے ہوئے تھے۔بے اختیار یہاں بیٹھ کر کام کرنے کو جی چاہا۔ایک پی سی کو گدگدایا تو اس کے دیے جل اٹھے اور پہلی سطر ابھری ''آپ کی ونڈوز اصلی نہیں ہے'' اور وہی ایکٹیویشن کا ڈائیلاگ باکس.....

ہم نے بمشکل اپنی ہنسی کو قابو کیا مبادا لوگ ہمیں خبطی سمجھیں،خود کو اپنے ہی گھر میں محسوس کیا اور گزشتہ چار روز سے جو احساسِ جرم اٹھائے پھر رہے تھے اسے ترقی یافتہ دنیا کے دل نیویارک اور اس کے دل یو این کے سیکنڈ فلور کے دبیز قالین پر اتار پھینکا۔شک تو پہلے بھی تھا،مگر یہاں آ کر ثابت بھی ہو گیا کہ خود امریکہ کی کھڑکیاں بھی اصلی نہیں ہیں!!

اسی سیکنڈ فلور کی کشادہ لابی میں دونوں اطراف پر ممبر ممالک کے جھنڈے ساتھ ساتھ آویزاں ہیں۔مندوبین اپنے اپنے جھنڈے کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں بنواتے نظر آئے۔ہم نے بھی یہ شوق پورا کیا۔یہیں پر وہ بڑا کانفرنس ہال ہے جس میں جنرل اسمبلی کے اجلاس ہوتے ہیں اور جو ایک طرح سے اس عالمی تنظیم کا علامتی نشان بن چکا ہے۔افتتاحی تقریب دو روز قبل یہیں منعقد ہوئی تھی۔کوفی عنان اتنا عرصہ سیکرٹری جنرل رہے ہیں کہ اس ہال کو دیکھتے ہی ذہن میں ان کی صورت ابھر آتی ہے۔ ☆

(جاری ہے)

مدر ٹریسا

نیلے بارڈر والی سفید سوتی ساڑھی میں ملبوس جھریوں زدہ چہرہ نرمی اور ملائمت سے بھرپور مسکراہٹ، زندگی کی چمک لیے ذہین آنکھوں والی متاثر کن شخصیت کا تصور کرتے ہی ایک نام ذہن میں آتا ہے ''مدر ٹریسا''۔ ساڑھی کے پلو کو سر پر لپیٹے انکے سراپے کو دیکھ کر تقدس کا احساس جاگزیں ہوتا ہے۔

مدر ٹریسا ہمارے ہی دور کی خاتون تھیں جن کو دیکھنے اور ملنے کی خواہش دنیا کے ہر اس فرد کے دل میں تھی جو ان کے کام اور مشن کے بارے میں جانتا تھا۔ لوگوں نے انہیں ٹیلی وژن پر دیکھا اخبارات میں انہیں پڑھا اور جانا۔

بیسویں صدی عیسوی میں انسانیت کی خدمت کیلئے زندگی وقف کر دینے والے افراد اور اداروں میں مدر ٹریسا اور ان کے قائم کردہ اداروں کا نام بے حد نمایاں ہے۔ انہوں نے پچاس برس تک بلا تخصیص ورنگ ونسل اور مذہب وقوم بیمار اور بے سہارا افراد کی خدمت کی کلکتہ اور دنیا کے دیگر علاقوں میں بھوکے ننگے، بے گھر، محتاج اندھے لنگڑے لولے، عمر رسیدہ، نشئی، سیلاب متاثرین، قحط زدگان، زلزلہ زدگان، وبائی امراض میں مبتلا افراد اور ایسے بے سہارا لوگ جن کی دنیا کو ضرورت نہیں تھی جو بے کار ہو چکے تھے۔ جن سے کوئی محبت نہیں کرتا تھا، نہ ہی کوئی دیکھ بھال کیلئے موجود تھا۔ وہ لوگ جو معاشرے پر بوجھ تھے ان لوگوں کی خدمت کیلئے بے شمار ادارے قائم کیے۔ ان کے بے لوث جذبے کی کوئی مثال رومن کیتھولک کلیسا میں نہیں ملتی۔ ان کی خدمات کا عالمی سطح پر اعتراف کیا گیا۔ ''مشنریز آف چیرٹی'' کی بانی کو امن کا نوبل پرائز 1997ء میں دیا گیا۔

مدر ٹریسا کا اصل نام ایگنس (Agnes Goxha Bojaxhiu) تھا۔ وہ 26 اگست 1910ء کو مقدونیہ کے قصبے میں پیدا ہوئیں وہ قصبہ اس وقت سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا ان کی والدہ کا نام ڈرینا اور والد کا نکولا تھا۔ ان کے تین بچے تھے۔ ایگنس ان میں سب سے چھوٹی تھی۔ وہ لوگ البانوی تھے۔ نکولا ایک خوش حال تاجر تھا۔ اس نے مقامی سیاست اور البانوی قوم پرست تحریک میں حصہ لیا۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں کٹر مذہبی کیتھولک تھے انہوں نے اپنے بچوں میں غریبوں کی مدد کرنے کی لگن پیدا کی۔ 1918ء میں نکولا کی وفات ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے سیاسی مخالفین نے اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اب خاندان کی کفالت کی تمام تر ذمہ داری ڈرینا پر آ گئی۔ وہ لوگوں کے کپڑے سی کر گھر کا خرچ چلانے لگی ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے خیراتی کام بھی جاری رکھے۔ وہ اکثر ننھی ایگنس کو ساتھ لے کر بیماروں، بوڑھوں اور تنہا افراد کی عیادت کیلئے جاتی وہ ایگنس کو سمجھاتی جب تم کوئی نیک کام کرو تو صلے کی امید نہ رکھو یوں سمجھو تم سمندر میں کنکر پھینک رہے ہو۔

ان جذبات اور مشاہدات نے ایگنس کے دل و دماغ پر پائیدار اثرات مرتب کیے وہ محنتی، غور وفکر میں کھوئی رہنے والی خاموش طبع بچی تھی جو کافی وقت گرجے میں عبادت کرتے ہوئے گزارتی۔ بارہ سال کی عمر میں اسے یقین آ گیا کہ وہ نن (راہبہ) بننا چاہتی ہے۔ والدہ نے اپنی کوئی رائے نہ دی بلکہ انتظار کرتی اور دیکھتی رہی کہ بیٹی کی مذہبی زندگی اپنانے کی یہ آرزو محض عارضی جوش کا نتیجہ تو نہیں ہے۔

مگر نوجوان ایگنس دلی طور پر یہ چاہتی تھی کہ وہ خدمت خلق کرے۔ اس نے راہباؤں کے ایک مشنری گروپ لوریٹو (Loreto) میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔ یہ لوگ کلکتہ میں کام کر رہے تھے اور ہندوستانی اور اینگلو انڈین لڑکیوں کو پڑھا رہے تھے۔ پہلے ایگنس نے ڈبلن (آئرلینڈ) میں واقع لوریٹو کی ایک خانقاہ میں رہ کر دو ماہ تک انگریزی

سیکھی۔تب تک ایگنس کی عمر اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی ا۔نگریزی سیکھنے کے بعد وہ ہندوستان روانہ ہوگئیں۔

دارجلنگ (بھارت) کی لوریٹو خانقاہ میں ابتدائی تربیت کے دوران انہوں نے انگریزی کے اسباق لینا جاری رکھے۔مقدس صحیفے قواعد، ہندی اور بنگالی زبانوں کا مطالعہ بھی ساتھ ہی ساتھ جاری رکھا۔ انہوں نے تعلیم دینا بھی سیکھا اور خانقاہی مدرسے میں یورپی اور ہندوستانی بچیوں کو روزانہ دو گھنٹے پڑھایا کرتی تھیں۔

1931ء میں ایگنس نے راہبہ بننے کا حلف اٹھایا اور مشنریوں کی سرپرست دلی سینٹ تھریسے کی نسبت سے ٹریسا کا نام اپنایا۔ تب انہیں کلکتہ کے ایک خانقاہی مدرسے میں پڑھانے کیلئے بھیجا گیا انہوں نے حتمی حلف 1937ء میں لیا اور مدرسے کی پرنسپل بن گئیں۔

سسٹر ٹریسا کو اپنے کام سے بہت محبت تھی لیکن وہ خانقاہوں کی دیواروں کے پرلی طرف رہنے والے غریبوں کی حالت زار کی وجہ سے پریشان رہتیں۔وہ ان کی مدد کرنا چاہتی تھیں مگر ادارے کے قواعد وضوابط ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔1946ء کے ہندو مسلم فسادات کے دوران وسیع پیمانے پر قتل وغارت دیکھ کر ان کا غریبوں کی مدد کرنے کا جذبہ اور بھی شدید ہوگیا۔کچھ ہی عرصہ بعد مدر ٹریسا نے اپنے دل کی آواز پر عمل کرتے ہوئے خانقاہ چھوڑ دی انہوں نے محض مذہبی خدمت انجام دینے کی بجائے انسانی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔1947ء میں کلیسا نے اجازت نامہ جاری کیا جسکے تحت وہ بدستور راہبہ رہتے ہوئے بھی غریبوں میں کام کرسکتی تھیں۔

دسمبر 1948ء میں پٹنہ میں واقع اپنی میڈیکل مشنری سنٹرز سے تین ماہ کی بنیادی تربیت حاصل کرنے کے بعد سسٹر ٹریسا واپس کلکتہ آئیں۔انہوں نے ''لٹل سسٹرز آف دی پورز (Little Sisters of the Poors) نامی ادارے کے ساتھ کام کیا جو بے سہارا بوڑھے لوگوں کو رہائش فراہم کرتے تھے اور پھر تن تنہا موتی ہل کی گلیوں میں نکل گئیں۔ انہوں نے ایک سکول شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور پہلے ہی روز وہ پانچ طالب علم جمع کرنے میں کامیاب ہوگئیں وہ زمین پر بیٹھ کر چھڑی کی مدد سے انہیں پڑھانے لگیں۔

تھوڑے ہی عرصہ میں درخت کے نیچے کھلے کلاس روم میں وہ چالیس بچوں کو زبان اور اعداد کے بارے میں پڑھا رہی تھیں ساتھ ہی ساتھ انہیں حفظانِ صحت کے اصول بھی بتاتی رہیں ۔ باقی وقت وہ بیماروں کی تیمار داری ، قریب المرگ لوگوں کی دیکھ بھال، بھوک اور غربت کے شکار افراد کی مدد کرنے میں گزارتیں۔

سسٹر ٹریسا نے 1949ء میں ہندوستانی شہریت اختیار کی اور ایک ہندوستانی کیتھولک استاد مائیکل گومز کے گھر منتقل ہوگئیں مائیکل نے ادویات کے حصول میں ان کی بہت مدد کی 1950ء میں جب سسٹر ٹریسا نے مشنریز آف چیرٹی کی ابتداء کی تو مائیکل کا گھر ہی اولین ہیڈ کوارٹر بنا۔

اب مدر ٹریسا کو امداد ملنا شروع ہو چکی تھی ۔انہوں نے عطیات سے حاصل ہونے والی رقم سے سب سے پہلے 1952ء میں مُردوں کو دفنانے کیلئے کالی گھاٹ (Home For Dying) کے نام سے ادارہ کھولا۔

پھر نرمل ہرائیڈے (Nirmal Hriday) نامی ادارہ بنایا جہاں غریب لوگ وقار کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو سکتے تھے۔ یہاں قریب المرگ لوگوں کو طبی امداد دی جاتی تھی۔مسلمانوں کو مرنے سے پہلے قرآن پڑھایا جاتا ، ہندوؤں کو گنگا جل بہم پہنچایا جاتا کیتھولک عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو آخری وقت کی رسومات ادا کروائی جاتیں۔وہ کہتیں جو لوگ بے یارومددگار جانوروں جیسی موت مرتے تھے اب ان کے ادارے میں آکر فرشتوں جیسے چاہے جانے کے قابل بن گئے تھے۔

کوڑھیوں کیلئے (Hospice Shantinagar) ''امن کا شہر'' نامی ادارہ قائم کیا جہاں کوڑھ کے مریضوں کو خوراک ، ادویات مرہم پٹی کا سامان اور علاج معالجے کی دیگر سہولیات دی جاتی تھیں۔

1955ء میں انہوں نے محسوس کیا کہ بے سہارا بچوں کیلئے بھی ادارہ ہونا چاہئے ۔ یوں نرملا شیش بھون میں (Children home of immaculate Heart) ''شفاف دل'' قائم کیا جو یتیموں اور بے سہارا

بچوں اور بے گھر افراد کیلئے جنت سے کم نہ تھا۔

1960ء میں انہوں نے تمام بھارت میں تقریباً تیس جگہوں پر کوڑھیوں کیلئے (Hopics) ہسپتال بنوائے۔

1965ء میں سب سے پہلا ادارہ جو بیرون بھارت تھا وہ وینزویلا میں قائم ہوا۔ 1991ء تک امریکہ سمیت 35 ممالک میں مشن ناداروں اور غریبوں کی مدد کر رہا تھا۔ مشنری برادرز آف چیرٹی نے 1987ء میں نیویارک اور کیلی فورنیا میں ایڈز کے مریضوں کیلئے علاج گاہیں کھولیں نیز روم، آسٹریا، تنزانیہ میں بھی ادارے کھولے گئے۔ ستر کی دھائی تک تمام ایشیائی ممالک سمیت افریقہ، یورپ اور امریکہ میں وہ اپنے ادارے کھولنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔

مدر ٹریسا کے ادارے کا حصہ بننے والے کو چار عہد کرنا پڑتے تھے جن میں غریبانہ طرز زندگی، فرمانبرداری، تجرد، اور اپنی تمام زندگی غربا کیلئے وقف کرنا شامل تھے۔۔

مدر ٹریسا کا کہنا تھا ''البانیہ سے میرا خونی رشتہ ہے، بھارت کی میں شہری ہوں، عقیدے کے مطابق کیتھولک ہوں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ پوری دنیا سے میرا تعلق ہے۔ جہاں تک میرے دل کی بات ہے تو میرے دل میں حضرت عیسیٰؑ بستے ہیں۔''

1982ء میں جب بیروت میں اسرائیل اور فلسطینیوں کی جنگ ہو رہی تھی وہ ریڈ کراس کے ورکرز کے ساتھ میدان جنگ کے اگلے محاذ پر جا کر سینتیس (37) بچوں کو بچا کر اپنے ساتھ لے آئیں ان کی مرہم پٹی کی اور پوری دیکھ بھال کی ذمہ داری لی۔

1988ء میں جب روس کی ریاست آرمینیا میں خوفناک زلزلہ آیا تو وہاں جا کر زلزلہ زدگان کی امداد کی اور چیف منسٹر نکولائی سے بھی ملاقات کی اور زلزلہ متاثرین کیلئے مفید مشورے دیئے۔

انہوں نے ایتھوپیا کے قحط زدہ علاقوں کا بھی دورہ کیا اور وہاں کے وزراء سے مل کر قحط زدگان کی امداد کیلئے اقدامات کیے۔

1990ء میں پاکستان تشریف لائیں۔ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں واقع فاطمہ چرچ میں ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ یہاں انہوں نے کوڑھیوں کیلئے ادارے کا سنگ بنیاد رکھا۔

1991ء میں مدر ٹریسا پہلی بار اپنے آبائی شہر البانیہ گئیں اور وہاں ایک مشنری ادارہ قائم کیا۔ 1996ء تک وہ 517 مشنری پروگرام اور سو کے قریب ملکوں کے دورے کر چکی تھیں۔

آپ پانچ زبانیں بہت روانی سے بول لیتی تھیں جن میں بنگالی، البانین، سربین، انگریزی اور ہندی شامل تھیں۔

1962ء میں مدر ٹریسا نے ''پدما شری ایوارڈ'' حاصل کیا تو تب پہلی بار وہ دنیا کے سامنے آئیں اور لوگ انہیں پہچاننے لگے۔ 1969ء میں انہیں جواہر لال نہرو ایوارڈ دیا گیا جو انہیں بنگلہ دیش میں خدمات کے عوض دیا گیا۔ یو ایس پریذیڈنشل میڈل آف فریڈم، نوبل امن انعام وغیرہ۔ اپنے تمام کیریئر کے دوران انہیں بے شمار انعام ملتے رہے۔

1996ء میں انہیں امریکہ کی آنریری شہریت دی گئی۔ یورپ اور بھارت کی بہت سی یونیورسٹیوں نے انہیں اعزازی ڈگریاں بھی دیں۔

گیلپ سروے کے مطابق اٹھارہ مرتبہ وہ اپنی زندگی میں دنیا کی نمایاں اور نامور خواتین میں شامل رہیں۔

2010ء میں بھارتی حکومت نے انکی سویں برسی کے موقع پر پانچ روپے کا یادگاری سکہ جاری کیا۔

مدر ٹریسا کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے دنیا میں مختلف چرچوں، عجائب گھروں میں ان کے مجسمے رکھے گئے ہیں۔ بہت سی سڑکوں کے نام ان سے منسوب ہیں۔ البانیہ کے ائیر پورٹ کا نام مدر ٹریسا البانیہ ائیر پورٹ ہے۔ 19 اکتوبر کو البانیہ میں مدر ٹریسا ڈے منایا جاتا ہے اور اس دن چھٹی ہوتی ہے۔ 2009ء میں انکے آبائی گاؤں مقدونیہ (Skopje) میں ''میموریل ہاؤس آف مدر ٹریسا'' بنایا گیا۔ ''مدر ٹریسا ویمن یونیورسٹی'' تامل ناڈو میں بنائی گئی۔ پانڈی چری (بھارت) میں ''مدر ٹریسا پوسٹ گریجویٹ اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف ہیلتھ سائنسز'' بنایا گیا۔ انڈین ریلوے نے ان کی یاد میں ایک نئی ٹرین ''مدرا ایکسپریس'' کے نام سے چلائی ہے۔

2005ء میں مدر ٹریسا کے یوم وفات پر ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر یونائیٹڈ نیشن کی جنرل اسمبلی نے ''امداد کا عالمی دن'' (International day of charity) منایا۔

مدر ٹریسا پر بہت سی کتب، آرٹ اور ڈاکومینٹری فلمیں بن چکی ہیں۔ کچھ کتابیں اور فلمیں ان کے خلاف لکھی اور بنائی گئیں۔ Christcopher Hitchen نے 1994ء میں ایک ڈاکومینٹری فلم بنائی جس میں اس نے الزام لگایا کہ وہ غریبوں کو اپنی قسمت پر شاکر رہنے کیلئے کہتی تھیں اور امرا کو خدا کے پسندیدہ بندے قرار دیتی تھیں۔ اس نے کہا کہ ویٹی کن (عیسائیوں کی مرکزی عبادت گاہ) کے کچھ پادریوں نے بھی مدر ٹریسا پر تنقید کی ہے اور ویٹی کن نے انہیں ''شیطان کا چیلا'' قرار دیا ہے، وہ شیطان کیلئے پوری تندھی سے کام کرتی رہی۔ اس نے مزید الزام لگایا کہ مدر ٹریسا کی توجہ لوگوں کی مدد کرنے پر نہیں بلکہ امداد اکٹھی کرنے پر تھی اس نے کہا مجھے یقین ہے وہ غربت ختم کرنے کے لئے نہیں بلکہ کیتھولک عیسائیوں کی تعداد بڑھانے کیلئے کام کر رہی تھیں۔ نیز وہ غربت کو سیاسی اقدام کے ذریعے ختم کرنے کی بجائے انفرادی مدد کے ذریعے جاری رکھنے کا باعث بن رہی تھیں۔

ویٹی کن کے بہت سے پادریوں نے اس بات کی تحقیق کیلئے کمیٹی بنائی جس نے فیصلہ دیا کہ مدر ٹریسا پر لگے الزامات غلط ہیں۔

2003ء میں انہیں Blessed کا خطاب دیا گیا جو ان کے کام اور زندگی کے مقصد کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے اور انکے اداروں کے بنیادی مقصد میں خدمتِ خلق اور غریب مریضوں کا علاج کرنا شامل تھا۔ زندگی سے مایوس مریضوں کو وہ اپنے ادارے میں لیتیں، ان کی خدمت کرتیں اور انہیں نئی زندگی سے ہمکنار کرواتیں جنہیں ان کے ڈاکٹر مرض الموت میں مبتلا قرار دے چکے تھے۔

مدر ٹریسا نے اپنا کام مسلسل جاری رکھا لیکن 1990ء کے بعد گرتی صحت نے انکی کارکردگی کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود وہ خدمت میں منہمک رہیں لیکن 1997ء تک حالات اس نہج کو پہنچ گئے کہ ادارے کی ذمہ داریوں کی کماحقہ تکمیل ممکن نہ رہی جس پر مدر ٹریسا کی جگہ سسٹر نرملا نے ادارے کے فرائض سنبھال لیے اسی سال 5 ستمبر 1997ء کو مدر ٹریسا کا انتقال ہوگیا۔

ان کی موت کا سوگ ساری دنیا میں منایا گیا۔ وہ کلکتہ میں دفن ہوئیں اور تجہیز و تکفین کی رسم ساری دنیا میں نشر کی گئی دور دراز سے لوگ ان کے جنازے میں شرکت کیلئے پہنچے۔

مدر ٹریسا اگرچہ دنیا سے جا چکی ہیں لیکن ان کے ہاتھوں شفا پانے والے مریض اور ان کے اداروں سے نئی زندگی کی نوید پانے والے افراد انہیں اپنی یادوں میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

1- استفادہ: The hundred most influential women of all the time ترجمہ: یاسر جواد

2- انٹرنیٹ

☆.....☆.....☆

ذروہ احسن

ٹھہر اے شوقِ بیتابی، سنبھل اے حسرتِ منزل

اس وقت کا تذکرہ جب تلخ حقیقتوں کا سامنا تھا اور حالات فوری اور سخت ایکشن کے متقاضی تھے

کسی شاعر نے کہا ہے۔

زندگی میں دو ہی لمحے مجھ پہ گزرے ہیں کٹھن
اک ترے آنے سے پہلے، اک ترے جانے کے بعد

ہم پر بھی دو وقت بہت بھاری گزرتے ہیں۔ ایک وہ جب موسم بدلتا ہے، اور دوسرا وہ جب اچانک کوئی شادی آ جاتی ہے۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ موسم بدلنے سے ہم نزلہ وزکام میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا شادی کی نوید سن کر کسی رشک وحسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بلکہ معاملہ صرف یہ ہے کہ ان دو مواقع پر جب ہم پہننے کے لئے پرانے کپڑے نکالتے ہیں تو...... ہائے......

کس کس سے کہیں ہم یہ غمِ دل کا فسانہ

جب بہت کوشش کے بعد، کسی نہ کسی طرح ان میں سما ہی جاتے ہیں تو کپڑے یہ فریاد کرتے معلوم ہوتے ہیں کہ

لے سانس بھی آہستہ کہ......

آئینے میں اپنا آپ دیکھتے ہیں تو اللھم احسن خلقی کما احسنت خلقی کی بجائے، اللھم احسن خلقی کما احسنت خلقی نکل جاتی ہے۔

سچ ہے آئینے سے برا دشمن کوئی نہیں۔ لگی لپٹی رکھے بغیر آئینہ دکھا دیتا ہے۔

سنا ہے تاریخ میں ایک بادشاہ سلامت گزرے ہیں جن کا حدود اربعہ اپنی سلطنت کی طرح کافی وسیع تھا۔ موصوف نے خواب گاہ کے باہر ایک آئینہ لگا رکھا تھا جس میں وہ اسمارٹ نظر آتے تھے۔ (حکمران ہمیشہ فریب خوردہ ہی رہنا پسند کرتے ہیں) ہم کیونکہ طبقۂ حکام کی بجائے طبقۂ عوام سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا تلخ حقیقتوں کا سامنا کرتے ہی بنتی ہے۔

اس دفعہ جب سردیوں کے کپڑے نکالے تو بے اختیار کہہ اٹھے

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

فکر مند ہوئے کہ خاندان میں ایک شادی بھی آ رہی ہے۔ گویا کہ ناک کا مسئلہ بھی ہے یہ حالات فوری اور سخت ایکشن کے متقاضی تھے اور اس کی زد میں سب سے پہلے ہمارا مینیو آیا۔ مختلف ہیلتھ گائیڈز اور ٹوٹکوں سے استفادہ کر کے ایک ڈائٹ پروگرام تشکیل دیا۔

☆ نہار منہ گرم پانی کا ایک گلاس لیموں ڈال کر پینا۔
☆ ناشتے میں بران بریڈ کا ایک سلائس اور گرین ٹی۔
☆ دوپہر میں ایک پیالہ اُبلی سبزی۔
☆ شام کو بغیر چینی کے چائے اور ایک wheat کا بسکٹ۔
☆ رات کو شوربے کے ساتھ آدھی روٹی۔

''واہ وا!'' اس شاندار مینیو پر ہم نے خود کو شاباش دی۔ کامیابی کی منزل بس سامنے ہی دکھائی دینے لگی۔ حصول منزل کو مزید سہل بنانے کے لئے صبح کی سیر کا آغاز کیا۔

علی الصبح جب سب شرفا سوئے پڑے تھے اور صرف آوارہ کتے ہی سڑکوں اور پارکوں کی رونق بڑھا رہے تھے، ہم نے واک کے لئے جوگرکس لئے حفظِ ماتقدم کے طور پر میاں صاحب کو بھی ساتھ لیا تا کہ اگر کوئی کتا فری ہونے کی کوشش کرے تو اس سے نمٹ سکیں۔

صبح کا سماں کیا سہانا سہانا تھا۔ بچپن کی پڑھی ہوئی نظم لبوں پر آ گئی۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی
یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل
ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل

جاگنگ ٹریک کافی لمبا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ شوق کا کوئی مول نہیں۔ سو ہم نے بھی ہر چہ بادا باد، کہہ کر اس پر قدم رکھا اور سفر کا آغاز کیا۔

چلتے گئے۔ چلتے گئے۔ چلتے گئے یہاں تک محسوس ہونے لگا کہ صدیاں بیت گئی ہیں۔ جب پاؤں غلط پڑنے لگے اور سانس بے ترتیب ہوا تو دریافت کیا:

''یہ ٹریک کب ختم ہوگا؟''

جواب ملا:

''ابھی تو آدھا ہی طے ہوا ہے۔''

اس حوصلہ شکن جواب کے بعد، ہم خود کو یہ تسلی دیتے ہوئے کہ آج پہلا دن ہے، رفتہ رفتہ حالات بہتر ہو جائیں گے، واپسی کے لئے مڑ گئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر سکھ کا سانس لیا تو ساتھ ہی یاد آیا کہ قریب میں حلوہ پوری کی بڑی زبردست دکان ہے۔ عام دنوں میں تو ہمارا اس طرف آنا نہیں ہوتا تھا پر آج سنہری موقع تھا ہماری فرمائش پر گاڑی کا رخ اسی طرف ہو گیا اور کچھ ہی دیر میں ہم دو پوریاں اور لسی کا گلاس چڑھا کر اونگھ رہے تھے۔

اب ہمارا روز کا معمول کچھ اس طرح سے تھا۔ نہار منہ ایک گلاس لیموں والا گرم پانی، واک، حلوہ پوری کا ناشتہ، دوپہر کھانے میں اُبلی ہوئی سبزی کا پیالہ جس کے بعد بھوک لگنے پر شام میں چائے کے ساتھ سموسے، پکوڑے یا بسکٹ رات کو بچوں کی فرمائش پر پزا، برگر یا بریانی وغیرہ وغیرہ۔

اس شاندار ہیلتھ پروگرام کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن ہمارے ہمیشہ سے اسمارٹ، میاں کی قمیض کے بٹنوں نے بند ہونے سے انکار کر دیا۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہ آیا پھر انہوں نے اسے سازش قرار دے کر آئندہ واک پر جانے سے قطعی انکار کر دیا۔

''لیکن پھر ہم شادی میں کیا پہنیں گے؟'' ہماری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''مجھ سے جتنے چاہے پیسے لے لو اور نئے کپڑے بنوالو۔'' انہوں نے ہاتھ جوڑے۔

''اور وہ سردیوں کے کپڑے.....''

''وہ بھی نئے لے لو۔ ایسا کرو یہ ATM کارڈ تم ہی رکھ لو۔''

''سچ؟'' ہم نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے اور بازار جانے کا پروگرام بنانے لگے۔

تو بہنو! یہ ہے میاں کی جیب سے پیسے نکلوانے کا صحیح طریقہ!!

☆.....☆.....☆

خطِ لاہور

تیرے بسیار خوروں کو سلام!

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ اہل قصور بے قصور ہوتے ہوئے بھی ''قصور یئے'' کہلاتے ہیں اور پھر اس پر اتراتے ہیں ۔ ہم نے اکثر نہایت بے ضرر قسم کے ''قصوریوں'' کو بڑے فخر سے یہ گاتے اور سناتے ہوئے سنا ہے۔

میرا سوہنا شہر قصور نی
جدیاں دھماں دور دور نی

(میرا شہر قصور بے حد خوبصورت ہے جس کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہے) جس طرح قصوریوں یا بے قصوریوں کو قصور یہ ہونے پر فخر ہے، کچھ اسی طرح لاہوریوں کو ''داتا کی نگری'' کے باشندہ ہونے پر بڑا فخر ہے۔اور وہ بھی سینہ چوڑا کر کے اتراتے اور گاتے ہیں۔

نئیں ریساں شہر لاہور دیاں
ایتھے وگڑیاں گلاں سنور دیاں
اے داتا پاک دی نگری اے
اے پھلاں وانگوں سجری اے

(شہر لاہور کا کوئی ثانی نہیں ۔ یہاں بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں۔سید علی ہجویریؒ کی یہ نگری پھولوں کی طرح تروتازہ ہے۔)

یقیناً یہ نگری داتا دربار پر چڑھائے جانے والے پھولوں کی طرح تروتازہ ہوگی ۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب اس کی سڑکوں پر تانگے چلا کرتے تھے ۔ بلکہ ایک دور ایسا بھی آیا جب اس شہر کو آلودگی سے محفوظ رکھنے کے لئے تانگے کے آگے جتے گھوڑے کے پیچھے بھی ٹاٹ کا پیمپر باندھنا لازمی قرار دے دیا گیا ۔ خلاف ورزی کے مرتکب کوچوان (کوچبان) کو جرمانہ کیا جاتا تھا۔اُس دور میں جمعدار (خاکروب) اور ماشکی مل کر گلیوں کو باقاعدہ دھودھو کر صاف کیا کرتے تھے۔

صفائی کے معیار کو کمیٹی (لاہور میونسپل کارپوریشن) کا مقرر کردہ سپروائزر جو داروغہ کہلاتا تھا، موقع پر چیک کیا کرتا تھا۔موقع پر جائے بغیر محض آفس میں بیٹھ کر صفائی کی رپورٹ تیار کرنے کا گُر اُسے نہیں آتا تھا!

انگریز کے یہاں سے بوریا بستر گول کرنے کے بعد صفائی کا معیار بھی رخصت ہوا۔

ملک نے ترقی کی جانب ایک قدم اور بڑھایا تانگہ گھوڑا بھی رخصت ہوا اور قوم کو عاجزی سے کام لینے اور حالت رکوع میں رہنے کی تربیت دینے کے لئے سڑکوں پر ویگن آ گئی کہ لاہوری مسلمان "**وارکعو مع الراکعین**" کی عملی تصویر بنا رہے ۔شہر لاہور کی پھولوں جیسی تر و تازگی ویگنوں کے دھویں اور سکون ، پریشر ہارن کی کان پھاڑ آواز کی بھینٹ چڑھ گیا۔ویگنوں کے ڈرائیور صاحبان کو پریشر ہارن بجانے کی کچھ ایسی لت پڑی کہ لات کھا کر بھی اُن کا ہاتھ ہارن سے اُٹھتا ہی نہیں۔

ویگنوں کے ڈرائیوروں کی بدتمیزی سے داتا کی نگری کے باشندوں کو بچانے کے لئے ترقی کی جانب ایک قدم اور بڑھا۔اب'' چاند گاڑی'' کہ جسے عوام الناس ''چنگ چی'' رکشہ کے نام سے جانتی ہے ،سڑکوں پر لایا گیا بلکہ ہر سو پھیلایا گیا۔

ویگنوں کے دھویں اور پریشر ہارن کا شور ہی کیا کم تھا کہ ''چنگ چی'' کا شورِ مسلسل عذاب کی صورت میں نازل ہو گیا۔ بے چارے لاہوریوں کا امن وسکون جاتا رہا اور ذہنی تناؤ بڑھتا رہا۔روایتی زندہ دلی رخصت ہوئی اور بلا تخصیص تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ،مفہوم ومطلب جانے بغیر لفظ ٹینشن (Tension) ہر ایک کی زبان پر آ گیا۔ یہاں تک کہ بکر منڈی

میں سودا طے ہو جانے کے بعد ایک دیہاتی بکرا فروش خریدار سے یہ درخواست کر رہا تھا کہ ''صاحب جی! اینوں (یعنی بکرے کو) ٹینشن نئیں دینی، میں اینوں بڑے پیار نال پالیا اے۔''

کہتے ہیں کہ ''جنے لہور نئیں دیکھیا اوجمیا ای نئیں۔''

بعض خود ساختہ محقق ٹائپ دانشور اصل لاہوریے کی یہ پہچان بتاتے ہیں کہ خالص لاہوریہ حرف ''ر'' کی بجائے ''ڑ'' اور ''ڑ'' کی جگہ ''ر'' بولتا ہے۔

اُن کی تحقیق کے مطابق کمپیوٹر کی زبان میں ایسی صورتحال کو ''ڈیفالٹ'' پروگرامنگ کہا جاتا ہے ۔ چنانچہ ایسے بزگوار کسی بھی لاہوریے کی شہریت کنفرم کرنے کے لئے اکثر اُسے یہ جملہ دہرانے کو کہتے ہیں۔ڈومیسائل، سرٹیفکیٹ کو وہ قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔

''منڈیر پر چڑیا بیٹھی تھی۔ میں نے چڑیا کو پتھر
مارا اور چڑیا پھُر کر کے اُڑ گئی.....''

''منڈیڑ پڑ چریا بیٹھی تھی۔ میں نے چریا کو پتھڑ
ماڑا اوڑ چریا پھُڑ کڑ کے اُڑ گئی.....''

لاہوریہ جب بھی بولے گا سنگیت کی اصطلاح میں ''تار سپتک'' اور عامی زبان میں اونچے سروں میں بولے گا، غالباً اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے ..... سنا ہے جہاں دلیل نہ ہو وہاں آوازِ بلند بڑا کام کرتی ہے!

یہ تو خیر زبانی کلامی بات ہوئی۔ حقیقت میں اصل ''لاہوریے'' دنیا کے دیگر ممالک کے باشندوں کی طرح داتا کی نگری میں ہنستے کھیلتے ہوئے دن کی ابتدا اپنے مرغوب ناشتے سے کرتے ہیں ۔ یہ کھانے کی محض شروعات ہی ہوتی ہے ۔ انتہا نہ جانے کب اور کیسے ہو اللہ ہی جانے، چونکہ ابھی پورا دن باقی پڑا ہوتا ہے۔

خطۂ لاہور کے ان جاں نثاروں نے کہیں سے سن رکھا ہے کہ آدمی جس حال میں فوت ہوگا مرنے کے بعد اُسی حال میں اٹھایا جائے گا۔ چنانچہ وہ کوشش کرتا ہے کہ کھاتے کھاتے ہی اللہ کو پیارا ہوتا کہ اسی کیفیت میں وہ اگلے جہاں بھی اٹھایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اصل لاہوریہ ہر جگہ اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتا ہوا نظر آتا ہے کہ نہ جانے کب فرشتہ اجل آن پہنچے۔ مبادہ وہ بغیر کھائے اٹھا لیا جائے۔ ریستوران میں کھانوں کے علاوہ سڑکوں پر بھی کچھ آئٹمز مثلاً فالودہ، دہی بھلے، لڈو پیٹھیاں والے، گول گپے وغیرہ میسر ہوتے ہیں، جنہیں نوشِ جاں کرنے کے لئے سکون و قرار سے بیٹھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس معاملے میں لاہوریئے بڑے درویش منش واقع ہوئے ہیں، اگر بیٹھنے کی سہولت میسر نہ ہو تو کھڑے کھڑے بھی کھا لیتے ہیں۔ بلکہ چلتے پھرتے بھی کھانے سے غافل نہیں رہتے اس مقصد کے لئے ان کا ٹارگٹ ٹھیلوں پر بکنے والی اشیاء مثلاً بھُٹہ، گنڈیریاں، مولی، گاجر، مالٹا اور کیلا وغیرہ جیسی اشیاء ہوتی ہیں جن کے چھلکے اور باقیات وہ با آسانی دائیں بائیں اُچھال سکیں۔ اس معاملے میں وہ اپنی عمر یا لباس کو حائل نہیں ہونے دیتے۔

زندہ دلان لاہور اس مقولے پر پختہ ایمان رکھتے ہیں کہ ''جان ہے تو جہان ہے پیارے'' چنانچہ لاہور میں اصل لاہوریہ آپ کو ''دھان پان'' سا کبھی بھی نہیں ملے گا۔ جو ملے گا صاحبِ توند ہی ملے گا۔

ہمارے لڑکپن میں نماز فجر کے بعد سے ہی لاہور کے بازار اور گلی کوچے مختلف انواع کے ناشتوں کی خوشبو سے مہکنا شروع ہو جاتے تھے۔ اب یہ سلسلہ خاصا سورج چڑھے شروع ہوتا ہے کیونکہ اب لاہوریوں کی صبح دس بجے سے پہلے نہیں ہوتی۔

عام لاہوریہ کارن فلیکس، چائے، ڈبل روٹی اور انڈا جیسی اشیاء کو ''جدیدیت'' کا نام دے کر ناشتہ کی فہرست سے خارج سمجھتا ہے۔ بالعموم ایسی اشیا کو مریضوں کے ناشتے کا نام دیتا ہے اور اگر کبھی بحالتِ مجبوری ایسا ناشتہ کرنا پڑ ہی جائے تو اس روز وہ اپنے تئیں روزے سے سمجھتا ہے کیونکہ اس کی دانست میں ایسے ناشتے سے جان نہیں بنتی بلکہ جان پر بنتی ہے!

یوں تو ناشتے کی اقسام اور ذائقہ کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم لاہوریوں کے مرغوب ناشتے درج ذیل ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک ناشتے کی دکان پر ''حلقۂ خریداراں'' دیکھ کر نو وارد

اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ گویا لاہوریے بس یہی ایک ناشتہ کرتے ہیں حالانکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ خالص لاہوریہ گھر میں تیار کردہ ناشتہ کرنا، اپنی کسر شان سمجھتا ہے۔

حلوہ پوری

مقامی زبان میں اسے حلوہ پوڑی کہا جاتا ہے۔ اس دکان پر رش دیکھ کر ''حلوہ اور مولانا'' کو لازم وملزوم سمجھنے کا تاثر زائل ہو جاتا ہے اور یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ ہم میڈیا کے غلط پروپیگنڈہ کا شکار رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں جو مقام غالب کو اور پھلوں میں جو مقام آم کو حاصل ہے، زندہ دلان لاہور کے جملہ ناشتوں میں وہی مقام حلوہ پوری کو حاصل ہے۔ خوردونوش کے معاملہ میں انتہائی محتاط زندگی گزارنے والے ایسے نازک مزاج ڈاکٹر صاحبان کہ جو محض حلوہ پوری کی خوشبو ہی سے کولیسٹرول ہائی ہو جانے کے خدشہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، پوری تلے جانے کا منظر ان کا بھی کفر توڑ ڈالتا ہے۔ یہ اور بات کہ دل کو سمجھانے اور سنبھالنے کے لئے اس ناشتہ کے بعد وہ Rolip یا اسی نوع کی کوئی دوسری گولیاں بھی کھاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پوری بنانے کا منظر ہی کچھ کم دلکش نہیں ہوتا۔ آپ خود ہی چشم تصور سے دیکھ کر فیصلہ کیجئے کہ اس میں بھلا اس محتاط ڈاکٹر کا کیا قصور جو مزے میں موت کو بھول جاتا ہے، کہ ایک گُرگ باراں دیدہ کہ جس کے دیدوں کا پانی مر چکا ہے، جس پر سفید براق لباس اور ایپرن باندھنے یا سر پر کاغذی ٹوپی پہننے کی بھی پابندی نہیں، جو محض کسی واشنگ پاؤڈر کے اشتہار کو ترسی ہوئی بنیان اور اسکرٹ نما تہبند زیب تن کئے، میدے کو اپنے ہاتھوں سے سہلا سہلا کر مناسب گولائیوں میں بڑے پیار سے تبدیل کر رہا ہے کہ جسے ''پیڑہ'' کہا جاتا ہے اس کی کاریگری کا کمال یہ ہے کہ کیا مجال جو اس کے ماہر ہاتھوں سے کوئی پیڑا کسی دوسرے پیڑے سے سائز اور وزن میں بڑا یا چھوٹا یا کم یا زیادہ ہو جائے۔ یہ سفید سفید چکنے چکنے پیڑے وہ بڑے قرینے سے ایک سینی یا ماربل کی چکنی سلیب پر قطار در قطار رکھتا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی کھڑا دوسرا گھاگ قسم کا ''لہوڑیہ'' پہلے تو ایک ایک پیڑے کو بڑی احتیاط اور پیار سے دباتا ہے۔ پھر یکلخت اس کے پیار کا انداز بدل جاتا ہے گویا اس کے اندر کسی مدرسہ کے استاد کی روح حلول کر گئی ہے۔ اب وہ پیڑے کو کسی ایسے بچے کا چہرہ سمجھ کر کہ جو گھر سے سبق یاد کر کے نہ آیا ہو تڑاخ تڑاخ مسلسل طمانچے مار مار کر اس پیڑے کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ اتنی مار کھانے کے بعد پیڑے کی ہیت بدل جاتی ہے اور وہ پرکار کی مدد کے بغیر ہی گول پوری کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اب وہ مرد کامل اسے کچھ ایسے ماہرانہ انداز سے فضا میں اچھال دیتا ہے کہ پوری مغلیہ دربار کی کسی رقاصہ کی طرح ایک انداز دلربائی کے ساتھ گھومتی ہوئی لہرا کر کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی کی آغوش میں جا گرتی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ جب تک وہ کڑاہی میں جا نہیں گرتی اس وقت تک گردوپیش کھڑے گاہک خاموش سہمی سہمی سی کیفیت میں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں کہ مبادا پوری اپنے مدار سے نکل کر ان میں سے کسی کے رخ تاریک پر Land کر جائے۔

کڑاہی میں کھولتے ہوئے تیل سے ہم آغوش ہوتے ہی پوری کسی بیورو کریٹ کے کبھی نہ بھرنے والے پیٹ کی طرح پھول جاتی ہے۔ جہاں سے ایک دوسرا فنکار کسی وزیر کے چاپلوسی مشیر کی طرح اپنے کڑچھے سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے۔ اور قریبی برتن پر رکھے ہوئے چھلنی کے پدر بزرگوارم یعنی ''چھاننے'' پر ڈال دیتا ہے۔ ''چھاننے'' پر قدرے استراحت فرمانے کے بعد پوری پر زائد از ضرورت آئل چھاننے کے نیچے رکھے برتن میں جمع ہوتا رہتا ہے جو مستقبل میں کڑاہی میں جا کر پھر پوریاں تلنے کے کام آتا ہے۔ اس عمل سے گزرنے کے بعد پوری ایسی جاذب نظر ہو جاتی ہے کہ اردگرد کھڑے شائقین کی نظریں اس پر ٹک جاتی ہیں۔

چنانچہ جس کا نصیب زوروں پر ہوتا ہے وہ تو مطلوبہ تعداد میں پوریاں شاپر میں ڈال دکاندار کو رقم تھما، اپنی کامیابی پر سینہ پھُلائے، اپنی بے سری آواز میں کوئی چلتا ہوا گانا گنگناتے ہوئے چلتا بنتا ہے۔ پیچھے

رہ جانے والے دیگر گاہک، دل چھوٹا نہیں کرتے بلکہ مستقل مزاجی سے اپنی باری کے انتظار میں کھڑے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرنے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔

لسی کلچہ

حلوہ پوری کے بعد لسی کلچہ کے ناشتے کا شمار لاہور کے قدیم ناشتوں میں ہوتا ہے۔ بظاہر یہ سیدھا سادہ سا ناشتہ ہے اس ناشتہ کے شائقین پہلوان ٹائپ لوگ یا پہلوانوں کے شیدائی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ ناشہ کرنے پر کوئی شرعاً، اخلاقاً یا قانوناً قدغن نہیں۔ تاہم یہ ناشتہ کرنے والا ایک مخصوص طبقہ ہے۔ یہ ناشتہ صحیح اور Crude فارم میں دودھ دہی کی دکانوں پر ہی پایا جاتا ہے جن کی سپلائی ڈیری فارم یا ڈائریکٹ پالتو بھینسوں سے ہوتی ہے۔

نان کا تل لگا بچہ کلچہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح دہی کی تنور کے بچہ ٹائپ دھاتی برتن میں کہ جو ''کُجا'' کہلاتا ہے، ڈال کر لکڑی کے مضبوط ڈنڈے نما ہتھیار سے (جو مدھانی کہلاتی ہے) پھینٹی لگائی جاتی ہے اور بالعموم پانی اور اگر اللہ توفیق دے تو پانی کی بجائے دودھ ملا کر جو مشروب تیار کیا جاتا ہے وہ لسی کہلاتا ہے اس کو نمک یا چینی اور برف ملا کر نوش جاں کیا جاتا ہے اور کلچہ دہی کے ساتھ یا بغیر دہی حسب توفیق کھایا جاتا ہے کچھ صاحب ذوق وثروت لسی میں اپنے معدہ اور قوت ہاضمہ کی مناسبت سے اس میں کھوئے کے پیڑے ڈال کر اس دوآتشہ بنا لیتے ہیں اور پھر اپنے ''ہم خیال گروپ'' کو فخر سے بتاتے ہیں۔

''پہلوان جی! او ڈاکٹر اینویں ای مینوں پنج سالاں تو کولیسٹرول، کولیسٹرول دیاں کہانیاں سنا کے تے ڈراندار ہندا اے۔ اللہ دے فضل نال کُج وی نئیں ہویا.....

''جواب میں ان کا ہم خیال ساتھی یہ مختصر سا جواب دیتا ہے۔

''پاہ جی! ڈاکٹراں نے وی تے ڑوزی کمانی اے ناں ..... جے ڈڑان گے نئیں تے کھان گے کتھوں!''

اس کے بعد سلسلہ کلام ڈاکٹروں کی ہوشربا فیس اور لیبارٹری کے غیر ضروری ٹیسٹوں کی طرف مڑ جاتا ہے۔

اگرچہ خالص دودھ دہی کے معدوم ہونے کے ساتھ ساتھ ناشتہ کرنے کا دلدادہ یہ طبقہ بھی زوال پذیر ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم اب بھی خالص دودھ دہی پینے کے شوقین حضرات دور دراز کا سفر کر کے بھی اپنے بھروسے کی دکان پر پہنچ ہی جاتے ہیں۔

یہ ناشتہ کرنے کے شوقین حضرات کے متعلق ایک عام تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ جاگتے کم اور سوتے زیادہ ہیں۔ جسے اس ناشتہ کے سائڈ ایفکٹس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آپ جانتے ہیں یہ دور ری مکسنگ کا ہے۔ مذکورہ لسی کلچہ کے شوقین پڑھے لکھے اور انٹلکچوئل قسم کے لوگ بھی اس وبا سے بچ نہیں سکے۔ چنانچہ ان حضرات نے مشہور زمانہ ''کچھوا اور خرگوش'' کی کہانی کی اپنے حسب حال مختصر اُری مکسنگ کچھ اس طرح کی ہے۔

''ایک خرگوش روزانہ دوڑتا ہے، اچھلتا ہے اور اس قسم کی بہت سی ''کسرتانہ'' حرکات کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ 15 برس زندہ رہتا ہے جبکہ کچھوا اس قسم کی کوئی ''ہل جُل'' والی حرکت نہیں کرتا پھر بھی 300 سال تک زندہ رہتا ہے۔

حاصل: سستی اور ہڈحرامی محنت سے بہتر ہے''

ویسے تو پوری قوم ہی اس کہانی پر عمل کر رہی ہے کسی بھی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے میں چلے جایئے آپ کو ہر اہلکار اس کہانی کا شاہکار کردار نظر آئے گا۔ تاہم کچھ پرائیویٹ اور نجی قسم کے اداروں میں زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے جنون میں مبتلا ہونے کی بنا پر کما حقہ، طور پر عمل نہیں ہو رہا تھا چنانچہ حکومت نے انہیں بھی اس ''قومی دھارے'' میں شامل کرنے کے لئے بجلی گیس پانی کی لوڈشیڈنگ کی اصطلاح تصنیف فرما کر اور اشیاء کی قیمتوں پر ہر قسم کا کنٹرول ہٹا کر کھل کر کھیلنے کا خوب موقع فراہم کیا۔

ہماری تاجر برادری ماشاءاللہ شروع سے ہی خاصی زیرک اور سمجھدار واقع ہوئی ہے۔ ماضی میں جب موجودہ بنگلہ دیش ہمارا بازو ہوا کرتا تھا

اور مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔اس دور میں بھی سیلاب مشرقی پاکستان کے دریاؤں میں آتا تھا اور اس برادری کی فہم وفراست سے یہاں مرغی کے انڈے یعنی مغربی پاکستان میں مہنگے ہو جاتے تھے۔اب تو خیر معاملہ ہی حکومت کی زیر سرپرستی لوڈ شیڈنگ کا ہے۔اس اصطلاح کو استعمال کر کے وہ جی بھر کر بہتی گنگا میں ہاتھ ہی نہیں دھو رہے بلکہ ڈبکی لگا رہے ہیں۔

ساحل سمندر پر آباد گرم مرطوب آب وہوا میں عمر گنوانے والے ایک حاسد ٹائپ بزرگوار سے لسی پینے کے درج ذیل فوائد سن کر سخت حیرت ہوئی۔

1۔لسی پینے والے کو کبھی کتا نہیں کاٹتا اور وہ پیٹ میں انجکشن لگوانے سے بچا رہتا ہے۔

2۔لسی پینے والے کے گھر میں چور نہیں گھستا۔

3۔لسی پینے والا خوش نصیب کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

جب اُن سے تفصیل اس اجمال کی پوچھی گئی تو انہوں نے اس طرح تشریح فرمائی۔

1۔چونکہ لسی پینے والے کو اوائل عمر میں ہی گنٹھیا کا مرض لاحق ہو جاتا ہے اور وہ لاٹھی ٹیک کر چلتا پھرتا ہے اس لئے کتا لاٹھی سے ڈر کر اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔

2۔لسی پینے کی وجہ سے پھیپھڑوں میں یا سانس کی نالیوں میں انفیکشن ہو جاتی ہے اور وہ تمام رات کھانستا رہتا ہے۔چور یہ سوچ کر کہ اہل خانہ ابھی جاگ رہے ہیں، چوری کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہے۔

3۔لسی پینے والا لسی کے مضر اثرات کے باعث عین عالم شباب ہی میں اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے لہٰذا بڑھاپا دیکھنا اسے نصیب ہی نہیں ہوتا۔

اس انتہائی جانبدارانہ اور حاسدانہ غیر مستند تحقیق سے اتفاق کرنا لازمی نہیں۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

اجنبی نہیں ہم.....!

ایک دن.....ایسا کیا ہوا کہ سارے بڑے پھوٹ پھوٹ کر رورہے تھے .....امی خندق سے سامان گھر میں واپس رکھ رہی تھیں اور سسکیاں لیتی جاتی تھیں.....ایسا کیا ہوا ہے!

دوسال پرانی بات ہے! چھٹی جماعت میں پڑھنے والی میری بھتیجی منیرہ نے بتایا کہ ہماری ٹیچر نے ہمارے ہاؤس کو پراجیکٹ دیا تھا جس میں سقوط ڈھاکہ بھی شامل تھا۔بچوں کو اس کے بارے میں کچھ معلومات نہیں تھیں اس لئے سب نے منع کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں شرمندگی تھی اور مزید ندامت کی بات کہ ٹیچرز بھی کچھ معلومات دینے سے قاصر تھیں! آہ! ہم اپنے ٹوٹنے والے برتنوں کے ڈیزائن اور قیمتیں تو یاد رکھتے ہیں.....کب اور کہاں سے خریدا تھا کبھی نہیں بھولتے !لٹنے والے پرس اور موبائیل کا ڈیزائن سے لے کر قیمت اور مالیت کو از بر رکھتے ہیں مگر اپنے ملک کا ٹوٹا بازو یاد نہیں ہمیں!....وہ کتنا قیمتی تھا،ہم تجزیہ بھی نہیں کرتے! حادثہ سے بڑا المیہ یہ ہے کہ لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر!! میں ایک دفعہ پھر سوز میں ڈوب گئی۔

پہلی دفعہ اس کرب کا احساس یونیورسٹی کی طالبہ کی حیثیت سے ہوا جب اپنی ایک جونیئر فیلو سے اس حادثے کا ذکر کیا اس امید کے ساتھ کے اس کا مطالعہ اور شعور قابل رشک تھا مگر اس نے لاپروائی سے کہا کہ میں تو اس وقت دو سال کی تھی مجھے نہیں علم ....اور میرا منہ کھلا رہ گیا اور مجھے اپنی ساتویں جماعت یاد آ گئی جب مغلیہ سلطنت کے بارے میں ٹیچر کے سوال پر ایک چلبلے سے لڑکے نے کہا تھا ''مس ہم اس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے.....'' اور پوری کلاس میں مس کے ممکنہ غصے کا سوچ کر سناٹا سا چھا گیا مگر حیرت انگیز طور پر خلاف عادت ہلکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیلنے لگی تھی۔.....

لیکن میں مسکرا نہ سکی اپنے اسکول کی یاد پر! مجھے محسوس ہوا کہ ہماری تاریخ نہیں لکھی جارہی (یقیناً یہ میری لاعلمی تھی، کہ کرنے والے تو اپنا کام کر ہی رہے تھے) تو بس میں نے ان حالات کے پس منظر میں ایک بچگانہ سا علامتی افسانہ لکھا جو شائع ہوا اور پسند بھی کیا گیا (افسوس کہ میں وہ میگزین محفوظ نہ رکھ سکی) مجھے یقین ہے کہ اگر میں اپنی اس ابتدائی تحریر کا ریکارڈ رکھتی تو آج بھی وہ valid ہوتا!

پھر دوسری دفعہ یہ احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں ایک پرائیوٹ اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ بچے تو خیر کیا جانیں اس دن کی اہمیت، جب والدین اور اساتذہ بھی اپنی تاریخ کے اس اہم حادثے سے نابلد ہیں ! بچے راشد منہاس کے بارے میں بڑے اشتیاق سے پڑھتے ہیں مگر اس سے ملحقہ تفصیلات نہیں جانتے۔ میں نے اپنے حصے کا کام کرنے کا سوچا۔اس ایونٹ کو سافٹ بورڈ سے لے کر اسمبلی تک نمایاں کیا۔ بچوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔چھوٹے چھوٹے کارڈز بنا کر اسٹاف میں تقسیم کیے جن پر بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) کا نقشہ فوٹو کاپی کر کے چپکایا اور ان کے نیچے ریمارکس کے ذریعے اس حادثے کی تفصیلات کے ذریعے جذبات کو مہمیز کرنے کی کوشش کی۔الحمدللہ

تمام اساتذہ نے اس کاوش کو پسند کیا خصوصاً نوجوان اساتذہ نے بہت دل خوش کیا یہ کہہ کر کہ ہمیں اپنی تاریخ کے ہر واقعے سے واقف رہنا چاہئے۔ ہاں افسوس تو سینئر اساتذہ کی طرف سے دیکھنے کو ملا ''.....اوہو یہ تو پرانی بات ہوگئی! آج کی بات کریں.....'' اف کیا سوچ ہے؟؟ حالانکہ ماضی تو وہ آئینہ ہے جس سے مستقبل کے خدوخال سنوارے جاتے ہیں!

اپنی تاریخ کے سرد وگرم کو اگلی نسل کو منتقل کرنا فرض عین ہے۔ ہر فرد

ایک پُل (bridge) کی حیثیت رکھتا ہے۔ نئی نسل کو پرانی نسل سے جوڑنے کا! گویا یہ فرض تو میری نسل کا ہے جو اس وقت بچپن کی حدود میں تھی۔

آہ کیا دریچہ کھل گیا!! کیا کیا منظر آنکھوں میں گھوم گیا!

وہ خندق جو جنگ کے آغاز پر لان میں کھودی گئی تھی جس کی طرف ہم سب خطرے کا سائرن ہوتے ہی دوڑتے، بلکہ بچوں کا دن کا بیشتر حصہ وہیں گزرتا۔ اسی میں بیٹھ کر گڑیا کی شادی رچائی جاتی اور نہ جانے کیا کیا سرگرمیاں ہوتیں! صرف کھیل کود نہیں ہوتا تھا بلکہ گھر گھر بپا ہونے والی دعائیہ تقریب میں بچوں کی مختلف عمر کے لحاظ سے کام ہوتے ۔کچھ بڑے سورہ یٰسین رالفتح کی تلاوت کرتے اور نھوں کو تسبیح یا دانے پکڑا دیے جاتے، کلمہ یا کوئی اور تسبیح کا ورد ہوتا۔ طارق، خالد، منصور، رانی، بنو، بلی، شانو، مانو.....یہ تو چند نام ہیں ورنہ بیس گھروں پر مشتمل ایک بلاک کے مختلف عمروں کے درجنوں بچے ہوتے جو یک جان و دو قالب بنے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک نومولود شازیہ کا اضافہ ہوا تھا جس نے اپنی زندگی کی پہلی ہی رات خندق میں گزاری تھی۔

ان گھروں کی قطار میں ایک خالی گھر ایسا بھی تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں جن رہتے ہیں، لیکن شاید جن بھی محاذ جنگ پر چلے گئے تھے کہ ان دنوں ہم بچے بلاخوف وخطر نیچی سی دیوار کود کر لان میں کھیلا کرتے تھے۔ واحدی صاحب کے گھر میں رہنے والی ایک بوڑھی خاتون جو ہم بچوں سے سخت نالاں رہتی تھیں ان دنوں کافی مہربان ہوگئی تھیں۔ ہر روز بچوں کو بلاتیں اور دعا وغیرہ کے بعد ہماری تواضع چنوں اور میٹھی گولیوں سے کرتیں جو ہم سب کے لئے بڑا اعزاز تھا اور ہم ان کی پھولوں سے لدی کیاریوں اور پھلوں سے لدے درختوں کو بڑے خوش ہو ہو کر دیکھا کرتے۔ جنگی ترانوں اور ملی نغموں پر ٹیبلوز ہوتے (یہ زیادہ تر جنگ کے اختتام پر ہوا تھا)۔

گویا جنگ کو بھی بھرپور طریقے سے منایا جا رہا تھا اور اس کا بھی ایک روٹین سا بن گیا تھا۔ لیکن ایک دن.....ایسا کیا ہوا کہ سارے بڑے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے.....امی خندق سے سامان گھر میں واپس رکھ رہی تھیں اور سسکیاں لیتی جاتی تھیں.....ایسا کیا ہوا ہے!

چند ماہ پہلے دادی جان کا انتقال موت کا پہلا تجربہ تھا۔ اور اس سے ذرا پہلے ہی پڑوس میں رہنے والی الماس اپنی امی اور ڈرائیور کے ساتھ ٹریفک حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ مگر یہ تو لگتا تھا اس سے بھی بڑا کوئی واقعہ ہوا ہے! اور ساری فضا سوگوار تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے اپنی اور بنو کی گفتگو ''.....تھوڑے دن ہم اور خندق میں رہ لیتے، فتح تو ملتی نا!.....'' فتح اور شکست کے الفاظ سے پہلی دفعہ آشنا ہوئے تھے۔ امی جان کو حد درجہ آزردہ دیکھ کر ہم بچوں نے امی کو مشورہ دیا کہ ابّا جان کو واپس بلوالیں (وہ ان دنوں مغربی جرمنی میں تھے) وہ سب کچھ ٹھیک کر دیں گے! ایک بچگانہ ذہن اپنے باپ کو آئیڈیل سمجھتا ہے کہ وہ سارے مسائل حل کر دے گا۔ مگر آہ اس غم کا مداوا تو کسی کے پاس نہ تھا!

اس المناک سانحے کی بہت سی یادیں ہیں (کچھ مجھے یاد ہیں جبکہ زیادہ تر امی جان کی زبان سے سن کر یادداشت کی اسکرین پر تازہ رہے) جن کو ضبط قلم کرنا میرے لئے دشوار ہو رہا ہے بوجہ وقت کی کمی اور جذبات کی شدت!

بس اس کے بعد کے واقعات بدلی ہوئی فضا کے ہیں۔ ہماری لائن میں بنگال سے تعلق رکھنے والے انکل شہید اللہ رہا کرتے تھے جو کلینک میں ٹیکنیشین تھے۔ ان کی بیٹی عالیہ ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھی اپنے کسی بھائی کو کندھے پر لادے ہوئے.... امی دوا لینے کلینک گئیں تو ان کا جملہ گونج رہا تھا فتح مندی کے نشے سے چور''...ہمیں تو ہزار سال بعد آزادی ملی ہے.....'' ذرا اس جملے میں چھپی نفرت اور تعصب کو دیکھیں!

ہمارے برابر کے برابر میں ایک بنگالی خاندان رہتا تھا، ان کے چار بیٹے تھے جن میں عبدالحنان سب سے بڑا تھا. وہ نہ جانے کہاں گم ہوگئے۔ شاید بنگلہ دیش ہی چلے گئے تھے۔ ان کے گھر میں انکل رضوان آ گئے۔ ان کے بھائی کی پوری فیملی مشرقی پاکستان میں لاپتہ ہوگئی (ایک بچی بہت سالوں بعد ملی جو عالمی رضا کاروں کو جنگل میں نیم مردہ حالت

میں ملی تھی)۔خود ہمارے خاندان کے کافی لوگ وہاں سے ہجرت کر کے یہاں آ کر کیمپوں میں رکے جنہیں امی اپنے گھر لے آئیں اور وہ کچھ مہینے ہمارے ساتھ ہی ٹھہرے۔

ان سارے واقعات نے ہر فرد کے احساسات کو یکسر تبدیل کر دیا تھا جس کے اثرات یقیناً ہم بچوں کے ذہنوں پر بھی پڑ رہے تھے۔ میرا سب سے چھوٹا بھائی جو اس وقت چند ماہ کا تھا، اس نے جب بولنا شروع کیا تو اس کے الفاظ کیا تھے؟ اگر کوئی اس کو مارتا یا ڈانٹتا تو وہ بہت معصومیت سے کہتا ''.....مجھے کوں (کیوں) مارتے ہیں؟ کیا میں بنڈالی (بنگالی) ہوں؟....'' یہ جملہ نہیں ایک رویہ ہے جس کا ردعمل سامنے آ رہا تھا!! اس کے پیچھے پوری داستان ہے۔ کیا ہم نے اس کے اسباب اور تفصیلات جاننے کی کوشش کی ہے؟ نہیں!! ایک مجرمانہ غفلت ہے جس کا شکار پوری قوم ہے!

بعد کے واقعات کچھ یوں ہیں کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر بنگلہ دیش کو تسلیم کیا گیا اور مجیب الرحمان اس کے سربراہ کی حیثیت سے یہاں شریک ہوا۔ مجھے یاد ہے اس دن اسکول اسمبلی میں اخبار کی سرخی پڑھ کر سنائی تھی اور باخبر رہنے پر پرنسپل سے شاباش پائی تھی۔

پھر.....وہ دن بھی یاد ہے جب مجیب الرحمان کا تختہ الٹ کر پورے خاندان کو قتل کر دیا گیا۔ صرف حسینہ واجد زندہ بچی تھی!!

جی ہاں! وہی خون آشام بلا بنی ہوئی ہے.....نہ جانے کتنے چراغ گل کرے گی!!

ہم شاید ماضی کو بھول جاتے مگر شہداء کی قربانی رائیگاں نہیں ہوتی اور منظر کچھ تبدیلی کے ساتھ ہمارے سامنے ہے! پھر آگ اور وہی نمرود ہے....اے اللہ! ہم اس فرعون سے نجات مانگتے ہیں! کاش ہمارے قلم کی روشنائی وہ جذبہ پیدا کرے کہ نفرتوں کی بھڑکتی آگ ختم ہو!!

میں اپنی داستان کا اختتام اس واقعے سے کرتی ہوں جو میرے مکمل شعور کا ہے۔ یہ 1992ء کی بات ہے۔ میں اپنی یونیورسٹی کی لیب میں تھی جب میرے سپروائزر کی بیگم (وہ خود بھی پروفیسر ہیں) تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ یہ خبر لے کر آئیں کہ دیوار برلن گر گئی ہے، مغربی اور مشرقی جرمنی مل گئے ہیں.....اور کتنا اچھا ہو کہ ہم بھی مل جائیں (وہ وہاں رہ چکی ہیں).....'' آمین! خواہش نیک سہی مگر منظر نامہ یہ ہے کہ اجنبیت کی دیواریں اتنی بلند ہو چکی ہیں کہ بیان سے باہر ہے.....

کیا یہ درست ہے؟ جی نہیں!!

حقیقی صورت حال یہ ہے کہ عوام جو مذہب سے جڑے ہیں ان کے درمیان رشتے اتنے ہی توانا ہیں، فاصلے جغرافیائی ہیں مگر ذہنی نہیں! اور عوام کا وہ حصہ جو اس تعلق کو نسل در نسل منتقل کر رہا ہے، آج بھی مضبوط ہے! وہ نظریہ جو ان کو جوڑتا ہے وہ صرف ایک ہے.....امت تقسیم سہی مگر ایک جسد واحد ہے!!

☆.....☆.....☆

دو متوازی دھارے

آج صبح واک پر نکلنے میں کچھ تاخیر ہوگئی۔ سو واپسی میں دو طرفہ روڈ کے دونوں جانب تعلیمی اداروں کی گاڑیوں کی چہل پہل ہوگئی۔ پنٹ شرٹ میں ٹائی لگائے صاف ستھرے اسکول کے بچے جن کی پشت پر بیگ لٹکے ہوئے تھے اور کاندھوں پر پانی کی بوتلیں اور قمیض کی جیب پر اسکول مونوگرام۔ بچیاں کچھ وی کی شکل میں دوپٹے لئے ہوئے کچھ سروں پر اسکارف۔ انکی پشت پر بھی کم وبیش انہی کے وزن کے بیگ، کچھ کے ہاتھوں میں لنچ باکس یا جوس کے ڈبے۔ یہ روشن پیشانیاں اور چمکتے چہرے جو پاکستان کا مستقبل ہیں۔ سڑک کے دونوں اطراف کچھ کچھ فاصلے پر سفید کوٹوں میڈیکل کالجز کی طالبات اور یونیفارم سے بے نیاز لیکن بہت سلیقے سے تیار یونیورسٹی کی طالبات۔

یکے بعد دیگرے پوائنٹس کی بسیں رک رہی تھیں۔ میں اپنے یونیورسٹی کے دور میں پہنچ گئی۔ اپنا طالب علمی زمانہ کوئی بھی کبھی بھی نہیں بھولتا گاڑیوں کے شور اور اپنے ماضی کا رابطہ جوڑنے کی کوششوں میں اچانک میری نظر قدرے دائیں جانب بڑے سے میدان پر مرتکز ہوگئی۔

یہ محلے کی بڑی جامع مسجد اور مدرسہ کے باہر کا منظر ہے۔ بہت بڑا مدرسہ جہاں ملک بھر سے پڑھنے بچے آتے ہیں شلوار قمیضوں میں ملبوس بچے قطاریں بنا رہے تھے۔ سروں پر ٹوپیاں تھیں۔ سب کے لباس شکنوں والے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کا لباس تبدیل کیے بغیر اپنی کلاس رومز میں چلے جاتے ہیں۔ زیادہ تر کے لباس سفید یا کریمی مائل تھے۔ میں تجسس میں کچھ اور قریب چلی گئی۔ اب ان بچوں نے ایکسرسائز شروع کردی۔ اس دوران انکے استاد نمودار ہوئے۔ جو چہرے سے پٹھان لگ رہے تھے۔ کندھے پر سرخی اور سفیدی مائل صافہ تھا دھاری دار، سر پر ٹوپی۔ وہ بھی ملگجے سے لباس میں ملبوس لیکن چاق وچوبند نظر آرہے تھے وہ طلباء کو جنکی تعداد 200 یا کچھ زائد بھی ہوگی پشتو زبان میں ہدایات دینے لگے اور طلباء اٹھک بیٹھک کے انداز میں انکی ہدایات پر مشق آگے بڑھاتے رہے۔ میرا اس عمل میں اتنا انہماک میرے شوہر کو پسند نہ آیا اور ہم تیز تیز قدم اٹھاتے گھر کی سمت چل پڑے۔

ٹائی لگا کر گاڑیوں میں بیٹھ کر جانے والے بچے اور مدرسہ کے باہر گراؤنڈ میں بچے بالکل ہم عمر ہیں۔ یہ سب اسکول کی عمر کے بچے ہیں۔ دونوں بظاہر دن کے آغاز میں حصول علم میں مشغول ہو جائیں گے۔ یہ دو طرح کے تعلیمی نظام جو مائنڈ سیٹ پیدا کر رہے ہیں وہی شاید ہمارے سماج کا سب سے بڑا المیہ اور ہر مسئلے کی جڑ ہے۔

دینی اور دنیاوی علوم دو الگ الگ بہنے والی نہریں ہیں۔ یہ مغرب کا تحفہ اور سیکولرازم کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ بلکہ یہ دو الگ الگ نظام ہائے تعلیم ہی سیکولرازم کے فروغ کا باعث ہیں۔ آج بھی ہمارے ہاں علماء کرام کا ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ دونوں نظام ہائے تعلیم الگ الگ برقرار رہنا چاہئیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اپنی اس سوچ سے وہ حقیقتاً سیکولرازم کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں یہ لادینیت جو اس وقت کا سب سے بڑا فکری اور نظریاتی فتنہ ہے کہ دنیا کے معاملات دنیا داروں کے پاس رہیں اور وہ دین اور مذہب کی رہنمائی سے آزاد رہیں جو مذہب ہے وہ ایک دائرے میں سمٹا رہے اور زندگی کا جز بن کر نہ رہے۔ گویا ریل کی دو پٹڑیاں ہیں جو متوازی تو چلیں گی مگر باہم مل نہیں سکتیں۔

دراصل جب مسلم معاشرے کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن گئی اس وقت انکے پاس اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ وہ اسلامی علوم اور فنون اور تہذیب کو بچانے کی کسی نہ کسی درجہ میں فکر کریں۔ یہ دینی نظام تعلیم ایک دفاعی حکمت عملی تھی کہ مسلمان بالکل مغرب کے رنگ میں نہ رنگ

جائیں کیونکہ ان کی تہذیب ایک غالب تہذیب ہے لہٰذا مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو کسی طرح بچایا جائے۔ ورنہ اس سے قبل کبھی دینی اور دنیاوی تعلیم کے الگ الگ نظام تھے بھی نہیں۔ ایک ہی نظام تعلیم بیک وقت علما، مجدد، ڈاکٹر، انجینئر اور سوشل سائنسز کے ماہرین تیار کر رہا تھا۔ مجدد الف ثانی اس کی بڑی مثال ہیں پھر شیخ احمد سرہندی جو سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم بنے وہ بھی مغلیہ دور کے اسی نظام تعلیم کی پیداوار تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک وسیع سلطنت کا نظام انہوں نے شاہجہاں کے زمانے میں کسی سیاسی فہم وبصیرت سے چلایا۔ صرف مجدد اور سیاستدان ہی نہیں بلکہ تاج محل بنانے والے استاد احمد اسی نظام تعلیم کے پروردہ تھے جنہوں نے دنیا کے سات عجائبات میں ایک عجوبہ بنایا۔ وہی نظام تعلیم، نصاب تعلیم اور تعلیمی روایت یقیناً ہمارا سرمایہ تھی جو دنیا اور دین کی تخصیص کے بغیر اتنے اعلیٰ پائے کے افراد مہیا کر رہی تھی۔ جب ڈاکٹر اور انجینئر ساتھ ساتھ عالم دین بھی ہوتے تھے او عالم دین سائنسی اور سماجی علوم سے آشنا۔

ہماری بدقسمتی یہی ہے اور آج معاشرے میں جو واضح طور پر طبقاتی تعلیم ہے اس کی وجہ نہیں ہے کہ آج تک یہ سوچا ہی نہیں گیا پاکستانی معاشرے کو کس طرح کے اہل علم درکار ہیں اور ایک اسلامی ریاست کی تعمیرِ نو کے لئے کیسے ماہرین درکار ہونگے۔ اگر ہم یہ مسئلہ اس وقت بھی حل کر لیں تو ملک وملت پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ کیونکہ یہ فصلیں دن بدن بڑھ رہی ہیں۔ مدارس میں پڑھنے والے وہ لاکھوں معصوم طلباء جو اتنا وقت اور صلاحیتیں اس تعلیم میں صرف کر رہے ہیں جتنا بیکن ہاؤس سسٹم میں پڑھنے والے طلباء اور طالبات۔ لیکن سر پر عمامہ، ٹخنوں تک شلوار، مشت بھر داڑھی انہیں سماج میں اجنبی بنائے ہوئے ہے۔ انکے بارے میں تاثر یہی ہے کہ یہ اپنے خول میں بند رہنے والے سائنسی اور سماجی علوم سے نابلد لوگ ہیں۔ سیاستدان، بیوروکریٹ، صنعتکار، ماہر فزیشن یا کسی طبقہ کا ماہر ہونے کے لئے سوٹڈ بوٹڈ اور کلین شیو ہونا لازمی ہے کہ دنیاداری ان لوگوں کا کام ہے جو دنیاوی علوم سے آگاہ ہیں۔ اس لئے ایوان اقتدار میں دنیا پرست براجمان ہیں اور مساجد ومنبر ومدرسہ علما آباد رکھیں۔ یا دنیاوی علوم کے ماہرین کو نظام سلطنت چلاتے ہوئے کبھی کبھی جب دینی رہنمائی کی ضرورت پڑے تو ''اسلامی نظریاتی کونسل'' ٹائپ چیز موجود رہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی تاریخ ''دارالعلوم دیوبند'' کے چاروں طرف دائرے کا سفر ہی طے کریگی؟ بلاشبہ برصغیر اور بالخصوص پورے جنوبی ایشیا میں پچھلے ڈیڑھ سو برس میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ہمیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ یہ ایک دفاعی حکمت عملی تھی۔ چونکہ معاشرے میں ان کی قیادت او رر رہنمائی کے امکانات ہی نہ تھے اس لیے اس رہنمائی کو مسجد اور مدرسے تک محدود کر دیا گیا۔ اس وقت نہ وسائل تھے نہ ہی وہاں کوئی آئیڈیل حالات تھے لہٰذا دین کو بچانے کی یہی آئیڈیل کاوشیں ہو سکتی تھیں جو دارالعلوم دیوبند کی صورت میں تاریخ کا روشن باب ہیں۔

لیکن ایک آزاد اسلامی ریاست میں دین کو صرف دارالعلوموں میں قید رکھا جائے یہ کہاں کا انصاف ہے؟ دن کو روزمرہ معاملات میں داخل کر کے عمومی درسگاہوں میں داخل کر کے کیوں نہ قائدانہ کردار ادا کرنے کے لئے تیار کیا جائے؟ دارالعلوم معاشرے میں محض برکت کے لیے نہ ہوں وہاں سے قائدانہ کردار تیار کیے جائیں۔ اور علماء قال اللہ، وقال الرسول کے ساتھ ساتھ سائنسی اور سماجی علوم سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتے ہوں اور یہ علما پیشہ ور کالجوں اور یونیورسٹیز میں بھی طلبا و طالبات کو دینی اقدار و روایات سکھائیں۔ اگر ایک طرف آپ میڈیکل وانجینئرنگ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبا وطالبات کا حال دیکھیں اور دوسری طرف مدارس کے طلبا کا، دو بالکل الگ الگ دنیائیں ہیں۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، انداز و الحوار سب کچھ ایک دوسرے سے بالکل جدا، اور دونوں فریقین اپنی اپنی دانست میں احساس برتری کا شکار..... اور ایک دوسرے کے وجود سے بڑی حد تک متنفر۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ مدارس میڈیکل کالجز میں بدل جائیں یا انجینئرنگ کالجز و یونیورسٹیاں علما بھی تیار کریں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ میڈیکل کالجز اور انجینئرنگ کالجز و یونیورسٹیاں دینیت کی تعلیم کیوں دے رہی ہیں؟ جبکہ قیادتیں وہیں سے تیار ہو رہی ہیں۔

اگر ماضی میں علوم وفنون کی اساس قرآن مجید تھا اور قرآن مجید نے وہ جڑ فراہم کی جس سے علوم وفنون کے سدا بہار گلستان پیدا ہوئے، آخر ہزار برس سے زیادہ علم وتحقیق پر مسلمانوں کے جھنڈے لہرائے، تو یہ آج کیوں ممکن نہیں؟ دین و دنیا کی تعلیم میں یہ امتیاز ہی مغرب کا وہ ہمہ گیر ایجنڈا ہے جو ہماری جڑیں مسلسل کھوکھلی کر رہا ہے۔ ہمیں جاننا چاہیے کہ ملک وملت کے مستقبل کا انحصار اسی امتیاز کے خاتمے میں پوشیدہ ہے۔ ☆

محشرِ خیال

کرامت بخاری۔لاہور

پرچہ قدرے کمزور نظر آیا۔سلام منقبت یا عقیدت، حمد، نعت زیادہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ محرم تھا۔بھوپال کی بیگمات کی بجائے کربلا میں خواتین کا کردار، یا اسوہ سیدہ پر کوئی مضمون ہونا چاہیے تھا، اسے تنقید نہ سمجھئے گا پرچے کو ہمارے اسلامی دنوں اور تہواروں سے مناسبت اور مطابقت زیادہ خوبصورت کردے گی۔

اداریہ اچھا ہے۔پچھلے آٹھ دس مہینوں میں یہ چوتھا بڑا قتل ہے جس کے قاتل بیرون ملک چلے گئے، چھوڑ دیئے گئے اور واقعہ دبا دیا گیا، یہ انتہائی خطرناک رجحان ہے اور یہ تاثر بری طرح بڑھ رہا ہے کہ اس مملکت خداداد میں امیر اور غریب کے لئے الگ الگ قانون ہے۔صبر، حوصلہ، اعتدال، قناعت، توازن، رواداری، وضعداری، بردباری، جیسی روایات اور اقدار کہاں چلی گئیں، عفو ودرگزر کیوں بھلا دیا گیا۔رحم، مہربانی، ہمدردی، دستگیری جیسے جذبے کدھر گئے۔دل گھبراتا ہے کہ ہم کدھر جارہے ہیں۔آج اہل قلم کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں، اللہ ہم پہ رحم کرے۔

قانتہ رابعہ۔گوجرہ

ابھی دو گھنٹے قبل بتول کا نیا شمارہ ملا ہے۔تبصرہ لکھنے کے لئے ہمیشہ سے میرا موٹو ''ابھی .....ورنہ کبھی نہیں'' رہا ہے۔آج فوری تبصرہ کی ویسے تو بے شمار وجوہات ہیں لیکن سرفہرست فرحت طاہر کا تبصرہ ہے۔ ہائے میرے دکھ کو انہوں نے اتنی پرتاثیر زبان دی کہ آپ نے بھی حصہ لے لیا۔میں تو اب یہ شکوہ کسی سے نہیں کرتی کہ لوگ کہتے ہوں گے شاید یہ اپنی تحریروں پر تبصرے کی خواہشمند ہے۔کچھ دینداروں نے ریاکاری کا شبہ ڈال دیا، یوں دکھے دل کے ساتھ بس ہم چپ رہے ہم ہنس دینے والا حال ہوگیا۔زبانی کلامی یا میسنجر کے ذریعے اپنی تحریروں پر بے شمار تبصرے وصول کرتی ہوں لیکن جو مزہ بذریعہ قلم تبصرہ پڑھنے کا ہے وہ ''جو مزہ چھجو کے چوبارے وہ بلخ نہ بخارے'' جیسی کہاوتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

خیر، فرحت کی تمام باتیں آمنا وصدقنا، بس ایک تجویز پر دل کھب گیا .....بتول کی ساٹھ سالہ تقریب! اسلامی کیلنڈر اور قمری سالوں کے حساب سے تو بتول ''ساٹھا'' ہو چکا ہے، یہ کام آپ 2015ء میں ہی کرلیں، 2017ء تو بہت دور ہے۔کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔پتہ نہیں اس وقت قانتہ زمین کے اوپر ہوگی یا نیچے۔کون جانے! کیوں نہ اس کو ہم اسی سہ ماہی میں کرلیں اگلے پل کا علم نہیں لیکن پلاننگ تو کرسکتے ہیں۔

ڈاکٹر نبیہہ حسن کی یاد میں ڈاکٹر سعدیٰ مقصود کا مضمون بہت زبردست چیز ہے۔پڑھنے کے بعد میں نے اپنی بیٹی مزنہ کو دیا کہ یہ ضرور پڑھو۔کچھ لوگوں کی اچھائیوں کا ان کے جانے کے بعد پتہ چلتا ہے، یہ اپنی زندگی میں ہی اچھی سمجھی جاتی تھیں۔یہ اعزاز بندے بہت کم دیتے ہیں۔

امی اور ابی جان کا کیا حال ہے؟ چھوٹی موٹی خبروں کا سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ ہے (صرف ادارہ بتول اور بتول کے مصنفین سے متعلقہ) تو ایک خبر حاضر ہے۔بتول سے عشق کرنے والی رفعت اشتیاق مرحومہ کے بیٹے کی کل شادی خانہ آبادی تھی، اللہ سب کی اولادوں کو خوشیاں عطا کرے۔آمین

ڈاکٹر تحریم اعجاز۔لاہور

اب تو ماشاءاللہ رسالہ مہینے کی پہلی تاریخوں میں ہی مل جاتا ہے قانتہ رابعہ کی کہانی ''غیرت ہے بڑی چیز'' پسند آئی۔قانتہ ہمیشہ کی طرح اچھوتے اور نئے موضوع چنتی ہیں فرح وقار کی کہانی ''میرے مہربان'' بھی پسند آئی، واقعی دلوں کا سکون اللہ کی یاد میں ہے انتخاب میں سدرہ سحر عمران کی کہانی ''بہتر ایک تہتر'' اچھی اور حسب حال ہے۔ہر فرقے اور سوچ کا مسلمان دوسرے کو غلط، کافر اور دوزخ کا حقدار سمجھتا ہے جبکہ خود کو جنت کا حقدار اب تو گلی، محلے میں ہر چوتھے گھر میں درس قرآن شروع ہوگیا ہے اور ہر درس قرآن دینے والی اپنے مسلک سے متعلق نئی باتیں متعارف کرا رہی ہوتی ہے، بجائے اس کے بنیادی عقائد کی اصلاح کی جائے۔مجھے تو یہ یوں لگتا ہے کہ درس قرآن کا یہ رجحان فائدے کی بجائے نقصان کا باعث بن رہا ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اعمال اور قلوب کی اصلاح کی توفیق دے۔آمین

ڈاکٹر فلزہ کا مضمون ''اللہ کے حکم میں بھلائی ہے'' بہت فکرانگیز تھا۔افشاں نوید کا مضمون، آزادی تجھے سلام نے دل اداس کردیا۔اللہ ہمیں آزادی کی نعمت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین ☆

بعد از خدا.....

اللہ نے اپنے حبیبؐ کو دنیا میں سب سے زیادہ مکرم و معظم رکھا.....سب سے نمایاں، تعریف کا حق دار، سب سے زیادہ عزت والا!

اللہ رب العزت نے اپنے بندوں میں سے کچھ بندے منتخب فرمائے اور ان کو عام لوگوں کی رشد و ہدایت کا ذریعہ بنایا۔ اسی رب نے اپنی حکمت کاملہ سے رشد و ہدایت کے لئے مبعوث کرنے والے خاص بندوں میں فضیلت اور درجے مقرر فرمائے۔

تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض

سب انبیاء کی امامت اور سرداری کے لئے محمد ﷺ کو منتخب کیا گیا۔ اور خاتم النبین کا اعزاز عطا کیا گیا۔

ہماری خوش بختی ہے کہ ہم امام الانبیاء کی امت کے ایک فرد ہونے پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ اس قابل فخر بات میں ہماری کوئی تدبیر، کوشش نہیں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے، یہ نعمت اسی منعم کی طرف سے ہے جو کہ منعم حقیقی ہے۔ ہم جس نبی کی امت میں شامل ہیں اسی نبی کا مقام و مرتبہ کتنا اعلیٰ و ارفع ہے؟ اس کا مختصر، مگر مکمل اور بہترین جواب یہ ہے کہ

''اللہ تعالیٰ کی عظمت، بزرگی اور شانِ اقدس کے بعد اس پیغمبر کا مرتبہ ہے کوئی انسان یا فرشتہ یہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اسی عظیم ہستی کی تعلیم کے مطابق، دنیا میں، والدین، اور استاد اور دیگر بزرگ رشتے ہیں جو کسی بھی انسان کے لئے محترم و معزز ہوتے ہیں۔ مگر آخری نبیؐ کا مقام و مرتبہ تو ان سب رشتوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اپنی ذات سے بھی زیادہ، اپنے نفس سے محبت سے بھی زیادہ محبت کا حق دار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو دنیا میں سب سے زیادہ مکرم و معزز رکھا۔ وہ مرحلہ نام منتخب کرنے کا تھا تو ''محمدؐ اور احمدؐ'' کا انتخاب ہوا کہ ایسا نام جس میں تعریف اور تحسین کے سارے راز مضمر تھے۔ سیرت و صورت کے لحاظ سے دوسروں میں سب سے نمایاں، تعریف کا حق دار، سب سے زیادہ عزت والا۔

حضور ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری سے پہلے ہی والد کی زندگی کا صفحہ کتاب زندگی میں نہ رہا۔ اسی طرح والدہ بھی حضور ﷺ کی کم سنی کے دور میں ہی اپنے رب کے پاس حاضر ہو گئیں۔ گویا کہ ان دونوں کا مقصدِ زندگی ایک عظیم نبی ﷺ کو دنیا میں لانے کا مقرر کیا گیا تھا۔ اب اس کے جیسا کوئی اور دنیا میں لانا مقصود ہی نہ تھا۔ وہ کوکھ صرف ایک شخصیت کی دنیا میں تشریف آوری کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس شخصیت کے پاسنگ بھی کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے آمنہ کی گود میں صرف ایک ہی ''چاند'' طلوع ہوا۔

اسی طرح اللہ الکریم نے اپنے آخری نبی ﷺ کو ''امی'' رکھا کہ وہ خود اس عظیم ہستی کا استاد تھا۔ بھلا کوئی استاد ہوتا تو دنیا کیسے اس عظیم نبی ﷺ کو اپنے استاد سے زیادہ عظیم مان لیتی؟.....استاد کا رتبہ، شاگرد سے زیادہ ہونا ایک فطری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی ایسا شخص پیدا نہیں کیا تھا جو خاتم النبین اور رحمۃ اللعالمین کو علم سکھانے پر مامور ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی شان کو براہ راست اپنی شان اور اپنے علم کے تابع رکھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا خود ''مربی'' اور ''استاد'' ہونا ہی نبیؐ کے شایان شان تھا۔

" وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ" نبی کے پیروکاروں کے لئے اطاعت میں آسانی فراہم کی۔ احترام کا درجہ سب انسانوں سے بڑھ کر قائم رکھا۔ ہمیں اس مخمصے سے دور ہی رکھا گیا کہ نبیؐ کے استاد یا والدین کا درجہ نبی سے بڑھ کر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ ہی کام کر رہی تھی کہ نبیؐ کی اولاد نرینہ زندہ

نہ رہی، اس لئے کہ امت کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے، اور افراط وتفریط کے عمل میں ایمان نہ کھو بیٹھے۔ جذباتی قومیں جب افراط وتفریط کے چنگل میں پھنستی ہیں تو شرک سے کم عمل پہ نہیں رُکتیں۔ اور شرک ہی وہ ظلم عظیم ہے جو کوئی فرد یا قوم اپنے اوپر خود کرتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اولاد میں بیٹیاں بھی حضورؐ کی زندگی میں وفات پا گئیں سوائے سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے، وہ بھی ان کے بعد کارگاہِ حیات میں چند مہینوں سے زیادہ نہ رکھی گئیں، اس لئے کہ محبت وعقیدت میں ''غلو'' شامل نہ ہو جائے۔ ان سارے صحابہ وصحابیات کی شعوری عظمت کو سلام ہے جنہوں نے حضور اکرمؐ سے رشتہ داریاں نبھائیں۔ نسب کی، سسرال کی رشتہ داریاں، یہ ایک ایسا نازک مرحلہ تھا جس میں افراط وتفریط کا عمل ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے مترادف تھا۔ غلو سے بچتے ہوئے، احترام و عظمت اور اطاعات کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے کسی نبی کے ساتھ جبکہ وحی نازل ہو رہی ہو، نسب وصہر کی تعلق داریاں نبھانا پل صراط پر چلنے جیسا ہی ہوتا ہے۔

انسانوں کی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ عقیدت میں افراط اور نفرت میں تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں اور خاندان، قبلہ، قوم اسی رویے میں بہت دور جا پہنچتے ہیں۔ ہر نبی کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی قوموں نے سیدھے راستے کی پٹڑی سے اترنے کا یہی طریقہ اختیار کیا، شیطانی وار اسی راستے سے کارگر ثابت ہوتا آیا ہے۔ اسلام نے اس معاملے میں بہترین راستہ دکھایا ہے۔ عقیدت کا ایک ہی پیمانہ مقرر کیا ہے۔ اللہ کی ذات کے بعد اس کا رسولؐ، اور دونوں کے درمیان کسی فلسفہ، علم، عقل کی گنجائش نہیں۔ جس طرح اللہ کی عبادت میں کوئی شریک نہیں، اسی طرح رسول کی اطاعت محبت عقیدت میں کوئی شریک نہیں۔ سب کچھ اتباعِ رسولؐ میں ہے اور رسول کی اطاعت پہلا زینہ ہے **قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی.....**

کوئی، دانش، کوئی عقلی دلائل اللہ کے رسول کی اطاعت میں حائل نہیں ہو سکتے اور کوئی ''اسوہ حسنہ'' کی جگہ نہیں لے سکتا۔ رسولؐ کا مقام عظیم ہے بلند ہے مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شانِ اقدس اور مقام بلند کے تحت ہے۔ یہ مقام نہ بڑھ سکتا ہے، نہ کم ہو سکتا ہے۔

اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مقام بعد میں آنے والے مسلمانوں سے بڑھ کر اور نبیؐ کے مقام ومرتبہ اور اسوہ حسنہ کے تحت ہے۔ صحابہ کرام کا یہ مقام نہ کوئی کم کر سکتا ہے نہ بڑھا سکتا ہے۔ بحیثیت انسان صحابہ کرام کی بشری کمزوریوں کو ہتک اور نفرت کا نشانہ بنانا ان کے ساتھ زیادتی ہے اور ان کمزوریوں کو وجہ نزاع بنا کر تفرقہ پیدا کرنا ظلم ہے۔ صحابہ کرام میں عزت وشرف کا جو مقام خود نبیؐ نے اپنی زبان مبارک سے متعین فرما دیا، اس پہ ادنیٰ درجے کا اشارہ یا اعتراض بھی نبیؐ کے سامنے گستاخی کرنا ہے۔

صحابہ کرام کے بعد وہ بزرگانِ دین جن کی بدولت ہم تک دین پہنچا۔ اور دین کو سمجھنے کے آسان راستے ہم پر کشادہ ہوئے، ان کا احترام ہم پہ واجب ہے۔ وہ ہمارے استاد ہیں اور ان کے احسانات کا بدلہ ہم چکانے سے قاصر ہیں۔ اگر ہم ان سب کے لئے اعمال صالحہ کے ذریعے صدقہ جاریہ بن جائیں تو ہمارے لئے بھی اللہ تعالیٰ صدقہ جاریہ کا انتظام فرما دے گا۔

اسی طرح باہم انسانی رشتوں میں احترام اور اطاعت کی ترتیب اتنی واضح ہے کہ اس میں شک وشبہ یا کسی الجھاؤ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ ترتیب قائم رہے تو بہترین پرسکون معاشرہ تشکیل دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔ اور ہر پہلو سے ہر رشتہ اپنے متعین مقام پر فیض اٹھاتا بھی ہے اور فیض پہنچاتا بھی ہے۔ ہر رشتہ اپنے متعین دائرہ میں مصروف عمل رہتا ہے اور انسانی فطری کمزوریوں کو درگزر کرنے، برداشت کرنے کا ماحول خود بخود بن جاتا ہے، وقت اور حالات اس میں تبدیلی لاتے بھی ہیں تو بنیادی تعلیم اطاعت اللہ اور اطاعت رسول کا کامل شعور، قدم ڈگمگانے نہیں دیتا کہ اردگرد کے باشعور افراد بھی اس کو سہارا دینے کو موجود ہوتے ہیں۔ حقوق وفرائض کی جنگ تو وہاں ہوتی ہے جہاں ان کا تعین نہ کیا گیا ہو۔ متعین ڈیوٹی اور ذمہ داری کے بارے میں خلجان کسی بھی فرد یا قوم کے لئے بھٹکنے کا باعث بن سکتا ہے۔ بحیثیت انسان کیا ذمہ داریاں ہیں؟ اور امت مسلم کا فرد ہونے کے کیا تقاضے ہیں؟ اور مسلمان

ہونے کے ناطے حقوق العباد کی کیا ترتیب ہے؟

دنیا کی ساری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ وہ فرد ہو، خاندان ہو یا قوم، کسی کو بھی اپنی متعین ڈیوٹی سے روگردانی، غفلت، خلجان، بغاوت، اور معاملات میں افراط وتفریط سے سوائے خسارے اور انتشار کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس کے رسول کی اطاعت سے شروع ہونے والی ترتیب میں الٹ پھیر معاشرہ کو پراگندہ کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ساری کائنات کا مالک ہے۔ اور اس کو اس نے ایک مکمل ضابطے میں جکڑ رکھا ہے اور اس کائنات میں کرہ ارض کی بھی ایک ترتیب ہے۔

اس کے باسیوں کو بھی خاص ضابطے کا پابند کیا ہے ان کو بھی اپنی منزل کی طرف رواں دواں رکھنے کا ایک سیدھا راستہ بتایا ہے۔ ہر انسان کی ایک ترتیب ہے، انسان پیدا ہوتا ہے تو شیر خوارگی، بچپن، لڑکپن، جوانی، ادھیڑ عمری بڑھاپا کی ترتیب سے گزرتے ہوئے کشاں کشاں منزل کی طرف چلتا رہتا ہے، حتیٰ کہ اپنے رب سے جاملتا ہے۔

اللہ کی مقرر کردہ اس ترتیب میں خلل ڈالنا کسی کے بس میں نہیں ہے یاد رہے کہ اسی طرح محبت، اطاعت، تعلق، حقوق وفرائض کی جو ترتیب اللہ نے بندوں کے درمیان بنادی ہے، اس نے اُسی ترتیب سے اپنے بندوں کا محاسبہ بھی کرنا ہے۔

☆.....☆.....☆